کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

- ازروئے قرآن حکیم ہمارا دین کیا ہے؟
- ہماری دینی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
- نیکی، تقویٰ اور جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے

تو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے جاری کردہ

خط و کتابت کورس :

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی

سے استفادہ کیجئے!

نیز

اللہ کے پر تاثیر کلام سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہونے کی خاطر
عربی زبان سیکھنے کے لئے، اس کے ابتدائی قدم کے طور پر

عربی گرائمر خط و کتابت کورس

میں داخلہ لیجئے!

مزید برآں ترجمہ قرآن حکیم کورس میں بھی داخلے جاری ہیں

مزید تفصیلات اور پراسپکٹس کے حصول کے لئے رابطہ کیجئے :

شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی، 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 5869501

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْرًا كَثِيرًا قرآن
(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۶ | شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ —— دسمبر ۱۹۹۷ء | شمارہ ۱۲

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۲۷۵۔ داؤد منزل متصل شادی ہجری شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

قرآن اکیڈمی کراچی کے تحت
ایک سالہ قرآن فہمی کورس کا اجراء

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تحت تعلیم و تعلم قرآن کی جس تحریک کا آغاز شہر لاہور میں ہوا تھا' اب بحمد اللہ وہ پاکستان کے دیگر بڑے شہروں میں بھی بتدریج قدم جما رہی ہے۔ کراچی' کوئٹہ' ملتان' فیصل آباد' پشاور اور اسلام آباد/راولپنڈی کے بعد اب سرگودھا میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے منسلک انجمنوں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ لاہور کی قرآن اکیڈمی کے طرز پر کراچی اور ملتان میں بھی Academies کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا ہے جبکہ فیصل آباد میں بہت جلد قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز ہو جائے گا۔

قرآن اکیڈمی لاہور کے تحت جاری ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس' تعلیم و تعلم قرآن کے ابتدائی قدم کے طور پر نہایت موثر اور مفید ثابت ہوا ہے۔ یہ کورس کالج اور یونیورسٹی سے تکمیل تعلیم کرنے والے ان افراد کیلئے ترتیب دیا گیا ہے جو ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے اور عربی زبان سیکھ کر قرآن حکیم کا براہ راست فہم حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں۔ اسلئے کہ ترجمے کی مدد سے قرآن کا مفہوم جاننے سے ایک انسان کلام الٰہی کی اس تاثیر سے محروم رہتا ہے جو ان لوگوں کو میسر آتی ہے جو کم از کم اتنی عربی جانتے ہوں کہ قرآن کو سنتے ہوئے اس کا مفہوم براہ راست سمجھ رہے ہوں۔ بقول اقبال ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی' نہ صاحبِ کشاف

قرآن اکیڈمی کراچی میں اگرچہ کامرس کالج کا اجراء دو سال قبل ہو گیا تھا لیکن بوجوہ ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس تاہنوز شروع نہیں کیا جا سکا ـــــ تاہم اب بحمد اللہ اس کورس کے اجراء کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ رمضان المبارک کے بعد ۱۶ فروری ۹۸ء سے ان شاء اللہ قرآن اکیڈمی کراچی میں تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔ کم از کم ایف اے/ایف ایس سی پاس طلبہ اس کورس میں داخلے کے اہل ہوں گے۔ بیرون کراچی سے تعلق رکھنے والے افراد کیلئے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ خواتین کیلئے بھی باپردہ اہتمام ہو گا' بشرطیکہ خواتین کے ساتھ ان کے شوہر یا محرم بھی کورس میں شریک ہوں۔

☆ ☆ ☆

قارئین نوٹ فرمالیں کہ اس سال محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رمضان المبارک میں قرآن حکیم کے ترجمہ کا دورہ قرآن اکیڈمی کراچی کی جامع مسجد میں مکمل کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

درس ۹

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان صفحات میں جاری ہے اس کا درس نہم سورۃ القیامہ پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ دُور کوعوں اور چالیس آیات پر مشتمل ہے اور قرآن حکیم کے انتیسویں پارے کے آخری رُبع میں شامل ہے۔ مصحف کی ترتیب کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کا نمبر ۷۵ ہے۔

سورۃ التغابن پر ان دروس کی تکمیل ہو چکی ہے جن میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت کا بیان جامعیت کے ساتھ آیا ہے' لیکن چونکہ ہمارے دین کے اعتقادی نظام میں' یا یوں کہہ لیجئے کہ اسلام کی فکری و نظریاتی اساسات میں قیامت پر ایمان اور آخرت پر یقین کو بہت اہمیت حاصل ہے' لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ ایک درس خاص اسی موضوع پر اس منتخب نصاب میں شامل کیا جائے' اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قیامت اور آخرت کے موضوع پر قرآن حکیم کی نسبتاً چھوٹی سورتوں میں جامع ترین سورت سورۃ القیامہ ہے۔

آخرت پر ایمان کی خصوصی اہمیت

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مضامین اور مطالب پر غور کریں' ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بالآخرت کی اہمیت کے بارے میں چند تمہیدی باتیں نوٹ کر لی جائیں۔

قیامت اور آخرت پر ایمان کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کے ہر پڑھنے والے کو باآسانی ہو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ قرآن حکیم کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں آخرت کا ذکر خفی یا جلی انداز میں موجود نہ ہو۔ چنانچہ مصحف کے ہر صفحے پر کسی نہ کسی اسلوب سے بعث بعد الموت' حشر و نشر' حساب کتاب' جزا و سزا اور جنّت و دوزخ میں سے کسی نہ کسی کا ذکر لازماً موجود ہے۔

جن مقامات کا مطالعہ ہم اس سلسلۂ درس میں کر چکے ہیں اگر ہم ان کا سرسری جائزہ لیں تو بادنیٰ تامّل نظر آجائے گا کہ ان میں سے ہر ایک میں آخرت کا ذکر موجود ہے۔ ہمارا پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر "ایمان" کا ذکر آیا' لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی۔ البتہ دوسرے ہی درس میں' جو سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ پر مشتمل ہے اور جسے ہم نے "آیۂ بِر" سے موسوم کیا تھا' ایمانیات کی تفصیل کے ضمن میں ایمان باللہ کے فوراً بعد یوم الآخر پر ایمان کا ذکر ہے : ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ "بلکہ حقیقی نیکی تو اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر۔"

ہمارا تیسرا درس سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک تو قانونِ مجازات و مکافاتِ عمل کا ذکر ہے جو بڑے جامع الفاظ میں حضرت لقمان کی وصیت میں آیا ہے :

﴿يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝﴾ (آیت ۱۶)

"اے میرے پیارے بچے! (اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ) انسان کے عمل کو (خواہ وہ نیکی ہو یا بدی) خواہ وہ رائی کے دانے کے ہم وزن ہو' پھر خواہ وہ کسی غار یا چٹان کے اندر چھپ کر کیا جائے' خواہ وہ فضاؤں اور خلاؤں میں جا کر یا زمین کی گہرائیوں میں اتر کر کیا جائے' اللہ اس کو (جزا و سزا کے دن) لے آئے گا۔ اور بے شک اللہ بہت باریک بین ہے' باخبر ہے۔"

اس کے علاوہ اسی رکوع میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے : ﴿اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ۝﴾ (آیت ۱۴) "میری ہی طرف لوٹنا ہے۔"

اگلی آیت کے آخر میں الفاظ آئے :

﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ۝﴾

"پھر میری ہی طرف تم سب کو آنا ہے' پھر میں تم سب کو جتلادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔" (آیت ۱۵)

ہمارا چوتھا سبق سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ پر مشتمل تھا' جس میں اہل ایمان کے لئے ان کی استقامت کا انعام جنّت کی شکل میں دینے کا وعدہ فرمایا گیا اور اس ضمن میں ارشاد ہوا :

﴿وَلَکُمۡ فِیۡهَا مَا تَشۡتَهِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ۝﴾ (آیت ۳۱)

"اس میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہ سب کچھ بھی ہو گا جسے تم طلب کرو گے"۔

پانچواں درس اساس القرآن سورۃ الفاتحہ پر مشتمل تھا' اس میں ایک عظیم آیتِ مبارکہ اسی حقیقتِ کبریٰ کے اظہار کے لئے وارد ہوئی' یعنی ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ۝﴾ "جزا و سزا کے دن کا مالک"

چھٹا سبق سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل تھا' اس میں آپ نے دیکھا کہ کس شدّ و مدّ کے ساتھ آخرت کا ذکر آیا :

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ۝﴾

"اے ہمارے رب! تو نے یہ سلسلۂ کون و مکاں فضول اور بیکار پیدا نہیں کیا ہے' تو پاک ہے' منزّہ ہے اس سے کہ کوئی بے مقصد اور عبث کام کرے' پس اے ہمارے آقا! ہمیں آگ کے عذاب سے بچالیجئو۔ یقیناً جس کو تو نے دوزخ میں ڈال دیا اسے تو

بالکل ذلیل اور رسوا کر دیا اور ایسے ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔"

ذرا آگے چل الفاظ آئے : ﴿وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ "اور (اے ہمارے رب!) ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کیجئو"۔ پھر مزید آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانبردار بندوں کو ان الفاظ میں اطمینان دلایا :

﴿ لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ﴾

"میں لازماً ان کی برائیاں ان سے دور کر دوں گا اور ان کو لازماً ان باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں۔"

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قیامت کے وقوع اور اخروی جزا و سزا کے یقینی ہونے پر کتنا زور ہے۔

اس کے بعد درس ہفتم یعنی سورۂ نور کے پانچویں رکوع میں قیامت کے دن کی ہولناکی کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آیا :

﴿ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ۝ ﴾

"(اللہ کے نیک اور محبوب بندے) لرزاں و ترساں رہتے ہیں' اس دن کے خیال سے جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گے۔"

درس ہشتم یعنی سورۂ تغابن میں تو بلاشک و شبہ یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا' چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کی تیسری آیت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے : وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝ "اور اسی (اللہ) کی طرف لوٹ جانا ہے۔" پھر ساتویں آیت میں پہلے تو منکرین قیامت کا یہ اعتراض یا مغالطہ نقل کیا گیا : ﴿ زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا ﴾ "ان منکرین کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ انہیں اٹھایا نہ جائے گا۔" پھر نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا :

﴿ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ﴾

"اے نبی! کہہ دیجئے : کیوں نہیں! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے کہ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے اور پھر تمہیں لازماً جتلا دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔"

اور ذرا آگے چل کر فرمایا :

﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾

"جان لو کہ وہ دن' جس دن وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن ــــ وہ ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن!"

یعنی اس روز جو کامیاب قرار دیا گیا وہی اصلاً کامیاب و کامران ہوا ــــ پھر اس کامیابی کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی کہ :

﴿ . . . يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ' ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ ﴾

"....اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے' اور یہی دراصل بڑی کامیابی ہے۔"

اس کے برعکس جو ناکام قرار پائے گا اور نامراد رہے گا اس کے انجامِ بد کا بیان اگلی آیت میں وارد ہوا :

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ' وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ ﴾

"اور جن لوگوں نے کفر و انکار کا راستہ اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلاتے رہے وہی لوگ دوزخ والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔"

اس سرسری سے جائزہ سے اندازہ ہو گیا کہ اب تک ہم نے جن معدودے چند مقامات کا مطالعہ کیا ہے ان میں بھی کس قدر شدّ و مدّ کے ساتھ بعثِ بعد الموت' قیامِ قیامت اور آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا ذکر آچکا ہے۔ یہاں ایک نکتہ اور بھی نوٹ کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ اہم تقابل سامنے آتا ہے کہ جہاں دوسرے ایمانیات کے لئے لفظ ایمان آیا ہے' وہاں آخرت کے لئے عموماً لفظ یقین استعمال ہوا ہے' جیسے سورۃ

البقرہ کے آغاز میں وحیِ الٰہی اور کتبِ سماویہ پر ایمان کا ذکر تو ان الفاظ میں آیا کہ :

﴿ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾

"اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر بھی جو (اے نبیؐ!) آپؐ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا۔"

لیکن آخرت پر ایمان کا ذکر ہوا ان الفاظ کے ذریعے کہ ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝﴾ "اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔" اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالآخرت میں وہ گہرائی اور شدّت مطلوب ہے جسے ہم "یقین" سے تعبیر کرتے ہیں!

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اصولی' نظری اور علمی اعتبار سے ایمان اصل میں نام ہے ایمان باللہ کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ "ایمان مجمل" میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے :

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيقٌ بِالْقَلْبِ

"میں ایمان لایا اللہ پر جیسے کہ وہ اپنے اسماء اور صفات سے ظاہر ہے' اور میں نے قبول کئے اس کے جملہ احکام' میں اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے۔"

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت دونوں ایمان باللہ کی فروع ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا تکمیلی ظہور ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر عملی اور اخلاقی اعتبار سے غور کیا جائے تو سب سے مؤثر ایمان' ایمان بالآخرت ہے' اس لئے کہ اگر آخرت کا یقین ہو گا' مرنے کے بعد محاسبہ کے لئے جی اٹھنے کا یقین ہو گا' جزا و سزا کا یقین ہو گا' جنت و دوزخ کا یقین ہو گا تو انسان کے رویّے میں عملی تبدیلی لازماً آئے گی اور اگر ایمان بالآخرت میں کمی رہ گئی تو ایمان باللہ بھی ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کی ایک علمی بحث بن کر رہ جائے گا اور ایمان بالرسالت بھی عشقِ رسول ﷺ کے محض زبانی دعوؤں کی صورت اختیار کر لے گا اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور

اتباع کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس مقام پر ضمناً یہ بھی جان لیجئے کہ قانونی، فقہی اور شرعی اعتبار سے اہم ترین ایمان ' ایمان بالرسالت ہے۔ چنانچہ ایمان باللہ اسی وقت معتبر ہو گا جبکہ اللہ تعالیٰ کو ان اسماء و صفات کے ساتھ مانا جائے جن کی خبر حضرت محمد ﷺ نے دی ہے اور ایمان بالآخرت بھی تب ہی معتبر ہو گا جب بعثِ بعد الموت ' حشر و نشر ' حساب کتاب ' وزنِ اعمال ' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی ان تفاصیل کو مانا جائے جن کی خبر حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے ہمارے یہاں خود کو مسلمان کہلانے والا عقلیت زدہ لوگوں کا ایک مختصر سا گروہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ آخرت حقیقی اور واقعی نہیں ہے بلکہ محض ایک نظریہ اور تصور ہے جس سے اصل مقصود دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہے ' چنانچہ جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا جو تصور قرآن مجید دیتا ہے اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی معاشرتی ' سماجی ' سیاسی ' معاشی الغرض پوری اجتماعی زندگی عدل و قسط پر قائم ہو جائے اور انسان دنیا میں امن و سکون کے ساتھ بہتر سے بہتر طریق پر زندگی بسر کر سکے۔ یہ خیال اپنی اصل کے اعتبار سے خالص گمراہی اور زندقہ ہے۔ آخرت ہرگز صرف تصور اور محض نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ ہے جو لازماً ظہور پذیر ہو گا۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے اس بات پر زور دیا گیا ہے ' جیسے مثلاً سورۃ الذاریات میں فرمایا : ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ "جس (قیامت و آخرت) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل برحق ہے ' سچ ہے اور جزا و سزا لازماً واقع ہو کر رہے گی" یا جیسے سورۃ المرسلات میں فرمایا : ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ "جس چیز کی دھمکی تمہیں دی جا رہی ہے وہ لازماً واقع ہو کر رہے گی۔" (یعنی نری دھمکی اور خالی دھونس نہیں ہے!) جو لوگ آخرت کو محض ایک تصور اور نظریہ قرار دے کر یہ امید بھی کرتے ہیں کہ اس سے اس دنیا میں عدل و قسط پر مبنی ایک اجتماعی نظام وجود میں آسکتا ہے وہ ایک شدید مغالطے میں مبتلا ہیں ' اس لئے کہ محض تصور و نظریہ سے یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا ' اس لئے کہ انسان کی سیرت ' اس کے کردار ' اخلاق اور اعمال و معاملات پر

واقعی اور عملی اثر محض آخرت کے تصور یا نظریہ کا نہیں بلکہ صرف یقین کے درجے تک پہنچے ہوئے ایمان ہی کا پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک معاشرہ میں آخرت پر قلبی یقین رکھنے والے لوگ معتدبہ تعداد میں موجود ہوں گے تو اس کی برکت سے اور اس کے نتیجے میں اس دنیا میں مبنی بر عدل و قسط اجتماعی نظام بھی لازماً وجود میں آئے گا۔ لیکن ایمان بالآخرت کا اصل مقصود صرف ہماری دنیوی بہبود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مطلوب محاسبۂ اخروی میں سرخرو اور کامیاب و کامران ہونا ہے اور یہ نصب العین ہماری دنیوی فلاح و بہبود اور امن و سلامتی سے اس طرح مربوط و متعلق ہے کہ آخرت کی وہ تفاصیل جو قرآن اور حدیثِ رسولؐ میں بیان ہوئی ہیں ان پر قلبی یقین اور اس کے مطابق اس دنیا میں اپنے رویئے اور عمل کی اصلاح و تعمیر کے بغیر نہ دنیا میں نظامِ عدل و قسط قائم ہو سکتا ہے اور نہ اخروی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ الغرض یومِ قیامت ایک اٹل اور شدنی امر ہے اور آخرت ایک حقیقتِ کبریٰ ہے اور اس کا حتمی اور یقینی علم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ہمیں پیشگی عطا فرمادیا ہے تاکہ ہمارے تمام اعمال کا اصل محرک اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اخروی نجات بن جائے، جس کے لئے قرآن حکیم دو ٹوک انداز میں ہمیں آگاہ اور متنبہ کرتا ہے :

﴿ فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ○ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ○ فَأَمَّا مَن طَغَىٰ ○ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ○ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ○ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ○ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ○ ﴾ (النازعات : ۳۴-۴۱)

"پس جب قیامت کا ہنگامۂ عظیم برپا ہو گا، اور جو کچھ انسان نے دنیا میں کیا ہے اس دن وہ اس کو یاد کرے گا، اور دوزخ ہر دیکھنے والے کے سامنے بے نقاب کر دی جائے گی، تو جس نے دنیا میں سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر مقدم رکھا تھا، اس کا ٹھکانہ تو بس دوزخ ہی ہے، اور جو اپنے رب کے حضور محاسبہ کے لئے پیشی سے ڈرا تھا اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکتا رہا تھا تو لاریب اسکا ٹھکانہ جنت ہے"۔

انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں

یہ بات بھی جان لیجئے کہ انکارِ قیامت اور انکارِ آخرت کی متعدد شکلیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ منکرین کا ایک استبعاد اور استعجاب تو وہ ہے جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے' اس کی صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ سورۂ ق میں فرمایا :

﴿ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝﴾

"(یہ کافر کہتے ہیں) کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے!)"

سورۂ یٰس میں جسے نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کا قلب قرار دیا ہے' ارشاد ہوتا ہے :

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝﴾ (آیات ۷۷' ۷۸)

"کیا انسان نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا' بایں ہمہ وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن کر کھڑا ہوگیا اور لگا ہماری نسبت باتیں بنانے اور اپنی اصل حقیقت کو بھول گیا' کہتا ہے کہ کون (آدمی کی) ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں!"

یہیں پر اگلی آیت میں فرمایا :

﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ۝﴾ (آیت ۷۹)

"(اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ جس نے ان کو اول بار پیدا کیا تھا وہی ان کو دوبارہ زندہ کرے گا اور سب خلق اس کے علم میں ہے"۔

یہ تو منکرین کا استعجابی انداز سے انکار کا ذکر ہوا' ایک صاف اور صریح انکار بھی ہے کہ مرنے کے بعد کوئی جی اٹھنا نہیں ہے' کوئی آخرت نہیں ہے۔ زندگی بس اس دنیا ہی کی

زندگی ہے۔ اس کو الحاد اور دہریت کہا جاتا ہے۔ اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ صرف عہدِ حاضر کی ضلالت ہے' اس خیال کے لوگ اُس وقت بھی موجود تھے جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا' چنانچہ ان کا قول سورۃ الجاثیہ میں نقل ہوا ہے :

﴿ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (آیت ۲۴)

"اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی زندگی سوائے ہماری اس دنیا کی زندگی کے' ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے سوائے گردشِ افلاک کے۔"

اس قول میں انکارِ آخرت ہی نہیں' اللہ کا انکار بھی بین السطور موجود ہے۔ یہ خالص الحاد و دہریت ہے جس کا پورا خلاصہ قرآن حکیم کی اس ایک آیت میں نقل کر دیا گیا ہے۔

انکار کی ایک تیسری شکل یہ ہے کہ نہ انکار ہو نہ اقرار' لیکن ظاہر ہے کہ اس کا عملی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو صریح انکار کا! قرآن مجید میں یہ شکل بھی کچھ لوگوں کے اس قول کی صورت میں بیان ہوئی ہے کہ :

﴿ .... إِنْ نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ۝ ﴾

"آخرت کا کچھ گمان سا تو ہوتا ہے کہ شاید واقع ہو لیکن اس پر ہمارا دل نہیں ٹھکتا' یقین حاصل نہیں ہوتا۔" (الجاثیہ : ۳۲)

ظاہر بات ہے کہ جب یہ شکل ہو گی تو انسان کا رویّہ اور اس کا طرزِ عمل ان ہی لوگوں کے مشابہ اور مطابق ہو گا جو آخرت کو نہیں مانتے' اگرچہ منطقی طور پر یہ نہ صریح انکار ہے' نہ واضح اقرار!

سب سے زیادہ خطرناک صورت یہ ہے کہ بظاہر پورے طور پر اقرار موجود ہو لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں مانی گئی ہوں جن کے نتیجے میں یہ اقرار اور یہ ایمان بالآخرت بالکل غیر مؤثر ہو جائے اور اس کا انسان کے عمل اور اس کے اخلاقی رویّے پر کوئی صحت مند اور صالح اثر مترتب نہ ہو۔ اس کی بھی تین شکلیں قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہیں —— سب سے پہلے شفاعتِ باطلہ کا تصور ہے کہ آخرت ہو گی تو سہی' لیکن ہماری کچھ

دیویاں اور دیوتا ہیں' یا کچھ مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں جو ہمیں وہاں سے چھڑا لیں گے :
﴿ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ﴾ "یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی بنیں گے۔"
ظاہر ہے کہ اس شکل میں بھی آخرت کا ماننا نہ ماننا برابر ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہاں شفاعتِ باطلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے' نہ کہ اس شفاعتِ حقّہ کا جس کا ثبوت قرآن اور حدیث دونوں سے ملتا ہے اور جو تین شرائط سے مشروط ہے ـــــ یعنی اولاً یہ کہ یہ اسی کی جانب سے ہو گی جسے بارگاہِ خداوندی سے اِذن مل جائے' پھر اسی کے حق میں ہو گی جس کے لئے اجازت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مبنی بر حق و انصاف ہو گی' نہ کہ عدل و قسط کے تقاضوں کو پامال کرنے والی۔

قرآن حکیم میں آخرت کے اس انکار مع الاقرار کی دوسری شکل یہ بیان ہوئی ہے کہ کچھ مرفّہ الحال اور دولت مند لوگ اپنی دولت مندی اور آسودہ حالی کو اپنے اس زعم کی دلیل بنا لیتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں' لہٰذا ہم پر اس دنیا میں بھی اللہ کا فضل ہو رہا ہے چنانچہ اس نے ہمیں یہاں دولت دی ہے' شرف و عزت سے نوازا ہے' لہٰذا اگر آخرت واقع ہو ہی گئی تو وہاں بھی ہم شرف و عزّت پائیں گے' قطع نظر اس سے کہ ہمارے اعمال کیا ہیں! سورۂ کہف میں دو افراد کے مکالمہ کے ضمن میں ایک ایسے ہی برخود غلط شخص کا قول نقل ہوا ہے کہ :

﴿وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝﴾

"(اول تو مجھے یقین ہی نہیں ہے کہ اللہ کی طرف لوٹنا ہے) لیکن اگر بالفرض مجھے اپنے پروردگار کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تب بھی اس نے جو کچھ مجھے یہاں دیا ہے وہاں وہ مجھے اس سے بھی بہتر دے گا۔" (آیت ۳۶)

یہی بات سورۂ حٰم السجدہ میں ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمائی گئی ہے۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے :

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِیْ ' وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی ' فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِمَا

عَمِلُوْا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ (آیت ۵۰)

"(انسان کا حال یہ ہے کہ) ہم جب اسے اپنی رحمت سے (آسودگی سے) نوازتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہے ہی، رہی قیامت تو اول تو مجھے یہ گمان اور اندیشہ ہے ہی نہیں کہ وہ واقع ہونے والی ہے، تاہم اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تو بھی میرے لئے وہاں اچھائی ہی اچھائی ہوگی۔"

اس انکار مع الاقرار کی تیسری و آخری شکل جو سب سے زیادہ لطیف لیکن اتنی ہی زیادہ خطرناک بھی ہے، یہ ہے کہ شیطان انسان کو اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفّاری کے حوالے سے دھوکہ دیتا ہے کہ وہ بڑا بخشن ہار ہے، بڑا نکتہ نواز ہے، لہٰذا وہ تمہیں معاف کر ہی دے گا۔ سورۃ الحدید میں تفصیلاً ذکر ہے کہ آخرت میں منافقین پکار پکار کر اہل ایمان سے کہیں گے کہ کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ بحیثیتِ مسلمان شامل نہ تھے، پھر یہاں ہمیں تم سے کیوں جدا کر دیا گیا؟ تو اہل ایمان سے جواب دلوایا جائے گا کہ تم بظاہر تو مسلمان تھے لیکن اعمال کے اعتبار سے اور ایمان، بالخصوص ایمان بالآخرت کے لحاظ سے تم نے اپنے آپ کو ریب و تشکک اور تربّص و تردّد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آیتِ مبارکہ کے آخری الفاظ ہیں :

وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ (آیت ۱۴)

"اور تم کو تمہاری تمناؤں (پر مبنی من گھڑت خیالات) نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ پہنچا (یعنی مہلتِ عمر تمام ہوئی) اور تمہیں خوب دھوکہ دیا اللہ پر (یعنی اس کی شان رحیمی و غفاری کے حوالے سے) اس بڑے دھوکہ باز (یعنی شیطانِ لعین) نے!"

مزید برآں آخری پارے کی ایک عظیم سورۃ یعنی سورۃ الانفطار کا تو مرکزی مضمون یہی ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ "اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔" اس لئے کہ جہاں وہ کریم ہے، رحیم ہے، غفور ہے وہاں وہ عادل و منصف بھی ہے اور "قائم بالقسط" بھی،

اور "شَدِیدُ العِقَاب" بھی ہے اور "سَرِیعُ الحِسَاب" بھی! حتیٰ کہ "عَزِیزٌ ذُوانتِقَام" بھی ہے یعنی زبردست اور شدید انتقام لینے والا۔ (اے اللہ! ہم تیری اس شانِ انتقام سے تیری ہی رحمت کے دامن میں پناہ کے طالب ہیں!)

پس انکارِ آخرت کی یہ مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں ان کا اختصار کے ساتھ تجزیہ اس لئے کردیا گیا ہے کہ ہم بھی اپنے ذہنوں کا بھرپور جائزہ لیں اور اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ مبادا ہمارے قلوب و اذہان اور فکر و نظر میں بھی اس قسم کے بے بنیاد وسوسوں اور موہوم خیالات کا عکس موجود ہو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بظاہر ہم مطمئن ہوں کہ ہم آخرت کے ماننے والے ہیں لیکن غیر محسوس طور پر ہمارے تحت الشعور میں اس قسم کے مغالطے موجود ہوں جن کا اس درس میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تمام باتیں جو اَب تک پیش کی گئی ہیں تمہیدی نوعیت کی ہیں۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اہم بات بھی اس موقع پر اجمالاً عرض کردی جائے اور وہ یہ کہ قیامت سے مراد کیا ہے؟ اس دنیا کا خاتمہ یا پوری کائنات کا خاتمہ؟؟ اس ضمن میں قرآن حکیم میں تین مراحل کا ذکر آتا ہے۔ ایک اس دنیا میں اور اس کے نوامیس و قوانین کے خاتمے کا مرحلہ ہے۔ دوسرا بعث بعد الموت کا مرحلہ ہے جس سے حیاتِ اخروی کا آغاز ہوگا اور جزا و سزا کے فیصلے نافذ ہوں گے۔ تیسرا اس پوری کائنات کے آخری انجام کا مرحلہ ہے۔ تدبّرِ قرآن کے ضمن میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن حکیم زیادہ تر گفتگو پہلے دو مرحلوں کے بارے میں کرتا ہے۔ تیسرے مرحلے کے بارے میں کوئی تفصیلی وضاحت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے، چنانچہ اس کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے! پہلے مرحلے کو قرآن مجید بہت سے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال لفظ "السَّاعَة" ہے، یعنی وہ متعین گھڑی جب ایک بڑی ہل چل مچے گی، ایک بہت بڑی تباہی آئے گی، دنیا کا موجودہ نظام درہم برہم ہوجائے گا، اجرامِ فلکیہ ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے مانند ہوجائیں گے۔ یہ نقشہ ہے "السَّاعَة" کا۔ اسی کو القَارِعَة، الحَاقَّة، الطَّامَّةُ الکُبریٰ اور الصَّاخَّة وغیرہ جیسے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے بعث بعد الموت کا، جس کے بعد

تمام اولین و آخرین اور کُل جِنّ و اِنس عدالتِ اخروی میں حساب کتاب کے لئے پیش ہوں گے۔ قرآن حکیم کے متعدّد مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر کا وہ دن نہایت طویل بھی ہوگا اور حد درجہ ہولناک بھی' جیسے کہ سورۂ مزّمّل میں فرمایا : ﴿يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۝﴾ "وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔" اور ہمارے ایک سابقہ درس میں (سورۂ نور' آیت ۳۷) میں یہ الفاظ آچکے ہیں کہ ﴿يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ "وہ دن جب دل اور نگاہیں سب کے سب الٹ جائیں گے!" اس کے لئے بھی قرآن مجید میں متعدّد الفاظ آتے ہیں' چنانچہ اسے "یَوْمُ الدِّین" بھی کہا گیا ہے اور "یَوْمُ الفَصْل" بھی' پھر اسی کو "یَوْمُ التَّغَابُن" بھی قرار دیا گیا ہے اور "یومُ الحِساب" بھی' لیکن اس کے لئے سب سے زیادہ کثیرالاستعمال نام "یَوْمُ القِیَامَة" ہے' یعنی کھڑے ہونے کا دن' جس کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر (سورۃ المطفّفین) میں ان الفاظ سے کی گئی ہے :

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

"وہ دن جس میں تمام انسان پروردگارِ عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے!"

قرآن کا عمومی اسلوب' مکّی اور مدنی سورتوں کا فرق

سورۃ القیامہ کے بارے میں چند تعارفی اور تمہیدی باتوں کے بعد اب ہمیں اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم پر غور کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے مناسب ہے کہ پہلے یک نظر اس پوری سورت کے سلیس اور رواں ترجمہ پر ڈال لیں' جو حسب ذیل ہے :

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں! مجھے قسم ہے نفس ملامت گر کی۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو (ٹھیک جوڑ دیں اور) برابر کر دیں۔ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) انسان اپنے فسق و فجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے کب ہوگا قیامت کا دن؟ ـــــ تو جب نگاہ چندھیا جائے گی اور چاند بے نور ہو جائے گا ـــــ اور سورج اور چاند یکجا کر دیئے جائیں گے ـــــ تو اس دن

کہے گا یہی انسان کہ کہاں ہے بھاگ جانے کی جگہ؟ ـــــ کوئی نہیں! کہیں ٹھکانا نہیں! اُس روز تو تیرے رب ہی کے حضور میں جا ٹھہرنا ہے۔ اُس روز جتلا دیا جائے گا ہر انسان کو ہر اس چیز کے بارے میں جو اس نے آگے بھیجی اور جو پیچھے چھوڑی۔ بلکہ انسان خود اپنے بارے میں (پورے طور سے) آگاہ ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے۔ (اے نبی ﷺ) آپ اس قرآن کے ساتھ تیزی سے اپنی زبان کو حرکت مت دیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کرلیں۔ تحقیق ہمارے ذمے ہے اس کو جمع کرنا بھی اور اس کو پڑھوانا بھی۔ پس جب ہم پڑھوائیں تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کیجئے۔ پھر بلاشبہ ہمارے ہی ذمے ہے اس کی مزید تشریح اور توضیح بھی۔ کوئی نہیں! بلکہ (تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ) تم لوگ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو۔ اور آخرت کو نظر انداز کردیتے ہو! بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوئے ـــــ اور بہت سے چہرے اس دن سوکھے اور اداس ہوں گے اور یہ گمان کررہے ہونگے کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے ـــــ کوئی نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آپھنسے گی' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟ اور انسان یہ سمجھ لے گا کہ اب (دنیا سے) جدائی کا وقت آگیا ہے۔ اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ اُس روز تیرے رب ہی کی طرف ہانکے جانا ہے۔ پس نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ موڑلی۔ پھر چل دیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا۔ افسوس ہے تجھ پر' پس افسوس ہے تجھ پر۔ پھر افسوس ہے تجھ پر' پس پھر افسوس ہے تجھ پر ـــــ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا نہیں تھا وہ منی کی ایک بوند جو ٹپکائی گئی؟ ـــــ پھر وہ تھا ایک لوتھڑا جسے اللہ نے بنایا اور سنوارا۔ پھر اسی میں سے بنا دیئے جوڑے' نر اور مادہ ـــــ کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کرسکے؟" (یقیناً اے ہمارے رب! تو اس پر قادر ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں!)

اس سورۂ مبارکہ کا جو مجموعی تأثر اور اس کے مضامین کا جو اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں قیامِ قیامت اور جزا و سزا کے لئے مثبت استدلال کو تو صرف دو قسموں کی صورت میں بیان کردیا گیا ہے' البتہ منفی طور پر منکرینِ قیامت کے موقف کا ابطال قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور ان کے اعتراضات اور دلائل کی قلعی

کھول دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک طرف ان کے استعجاب اور استبعاد کو دور کرنے کے لئے اللہ کی اس قدرتِ کاملہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے جس کا سب سے بڑا مظہر خود انسان کی اپنی پیدائش ہے اور دوسری طرف منکرین قیامت کی گمراہی کا اصل سبب بھی بیان کردیا گیا اور ان کے مرض کی اصل تشخیص بھی کردی گئی، یعنی حُبِّ عاجلہ (دنیا کی محبت) میں گرفتار اور فسق وفجور اور ظلم وتعدّی کا خوگر ہو جانا، جس کی بناء پر انسان حساب کتاب اور جزاء وسزا کے تصور تک سے بھاگتا ہے اور اس کبوتر کی مانند جو بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے، نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ قیامت، حشر ونشر، حساب کتاب اور جزاء و سزا کے تصور سے اپنے موجودہ عیش کو مکدر کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان چاہے زبان سے کچھ کہے، اس کے انکارِ قیامت کا اصل سبب وہی ہے جو اس سورۂ مبارکہ میں ﴿بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝﴾ "بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنے فسق وفجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے" اور ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝﴾ "کوئی نہیں! بلکہ تم لوگ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو" کے الفاظ مبارکہ میں بیان ہوا۔ ضمنی طور پر ایک نہایت لطیف پیرائے میں یہ حقیقت بھی کھول دی گئی کہ دعوتِ دین اور ابلاغ وتبلیغ حتیٰ کہ تحصیلِ علم کے معاملے میں بھی "عُجلت پسندی" مناسب نہیں ہے۔

یہ تو اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا اجمالی تجزیہ ہوا۔ اب مناسب ہے کہ اس سلسلہ وار مطالعہ سے قبل قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور اس کی مکی اور مدنی سورتوں کے مزاج کے فرق کے ضمن میں بعض باتیں بطور تمہید عرض کردی جائیں جو ان شاء اللہ فہم قرآن بالخصوص تدبّرِ قرآن کے ضمن میں کلید کا کام دیں گی۔

قرآن مجید کے عمومی اسلوب کے بارے میں یہ بات جان لینی از حد ضروری ہے کہ قرآن حکیم عام دنیوی تصنیفات کی مانند نہیں ہے۔ ہماری تصانیف اور تالیفات کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے، ایک خاص ترتیب ہوتی ہے اور ایک معین نہج ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں ابواب ہوتے ہیں اور ہر باب میں مضمون کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے، پھر اس کو اگلے باب میں دہرایا نہیں جاتا۔ جو لوگ قرآن حکیم کو دنیا کی عام تصنیفات و تالیفات پر قیاس کرکے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں دقت کا سامنا بھی ہوتا ہے اور ناکامی بھی

ہوتی ہے۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ نہ قرآن مجید عام تصانیف و تالیفات کی مانند ہے' نہ اس کی سورتوں کی حیثیت کتاب کے ابواب کی ہے' نہ یہ مجموعۂ مضامین یا مجموعۂ مقالات کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کا اسلوب خطبہ کا ہے اور قرآن مجید کی سورتیں گویا کہ خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مصحف میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کو ہم "مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب خطبہ کے اسلوب میں چند امور اس کے لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ ان امور کو سمجھ لیا جائے تو قرآن حکیم کے فہم میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

پہلی بات یہ کہ جب کوئی شعلہ بیان خطیب کوئی خطبہ دے رہا ہو تو اس میں بار بار خطاب کا رخ بدلتا ہے' چنانچہ ابھی خطیب دائیں طرف مخاطب تھا اور گفتگو کر رہا تھا' پھر وہ بائیں جانب کے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا' اب وہ ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اسی طرح اگرچہ اس کے مخاطب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ ان سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے لیکن کبھی یہ گفتگو صیغۂ حاضر و خطاب میں نہیں بلکہ صیغہ غائب میں ہونے لگتی ہے' اور اس میں فصاحت و بلاغت کا ایک خاص رنگ اور تاثیر کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' اس کے برعکس اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ موجود نہیں ہوتے' ان کو وہ موجود اور حاضر فرض کر کے ان سے صیغہ خطاب و حاضر میں گفتگو شروع کر دیتا ہے اور دوران خطبہ یہ "تحویلِ خطاب" بار بار اور وقفہ وقفہ سے ہوتا رہتا ہے۔ مزید برآں خطبات میں عام طور پر مخاطبین کے اعتراضات کو نقل کئے بغیر اور ان کے سوالات کو بیان کئے بغیر ان کے جوابات دے دیئے جاتے ہیں' اور ان جوابات کا اسلوب و انداز ایسا ہوتا ہے کہ مخاطبین خواہ وہاں موجود ہوں خواہ نہ ہوں اور ان تک وہ باتیں بعد میں روایتاً پہنچیں' خود جان لیتے ہیں کہ یہ باتیں فلاں اعتراض کے جواب میں کہی جا رہی ہیں اور یہ تشریحات فلاں مسئلہ کی وضاحت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا تھا خطبہ کے اس اسلوب و انداز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو فہمِ قرآن میں بڑی مدد ملے گی اور اگرچہ پورے قرآن کا اسلوب یہی ہے' تاہم بعض سورتوں میں یہ بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ خطبہ کا یہ انداز اس سورۂ مبارکہ میں نہایت شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہاں ساری

گفتگو منکرینِ قیامت سے ہو رہی ہے، کبھی صیغۂ حاضر میں ان سے براہ راست خطاب ہے، کبھی "الانسان" کے حوالے سے بصیغہ غائب گفتگو ہو رہی ہے۔ درمیان میں چند باتیں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرما دی گئیں اور اس طرح تحویلِ خطاب کی نمایاں مثال سامنے آ گئی۔ پھر خطاب کا رخ دوبارہ منکرینِ قیامت و آخرت اور مخالفینِ بعث بعد الموت کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا خطابت کے اسلوب و انداز کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ اسلوبِ قرآنی کی نہایت اہم اور نمایاں مثال ہے۔

دوسری بات یہ کہ جیسے ایک اعلیٰ پائے کے خطیب کے ہر خطبے کا ایک مرکزی موضوع یا مرکزی خیال یا ایک عمود ہوتا ہے اور خطیب کی تمام گفتگو اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے اور اگرچہ وہ تمہید کے طور پر یا مختلف دلائل و شواہد کے ضمن میں ایسے مباحث پر بھی اظہار خیال کرتا ہے جن کا بظاہر اس کے خطبہ کے عمود یا مرکزی مضمون سے تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن جب وہ بحث کو سمیٹتے ہوئے گفتگو کو ختم کرتا ہے تو خطبے کے تمام اجزاء اس خطبے کے مرکزی موضوع یا عمود سے مربوط نظر آتے ہیں۔ تو جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت ایک خطبۂ خداوندی کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ قرآن حکیم کی ہر سورۂ مبارکہ کا اپنا معیّن مرکزی خیال، موضوع اور عمود ہے اور نہ صرف یہ کہ پوری سورت اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے بلکہ جس طرح ایک حسین و جمیل ہار میں ہر موتی دوسرے موتی کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اسی طرح سورت کی تمام آیات باہم بھی مربوط ہوتی ہیں اور بحیثیتِ مجموعی سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ بھی ان کا ربط قائم رہتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ مصحف جس ترتیب کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے اس میں بھی گہرا ربط موجود ہے اور اس کی تمام سورتیں بھی باہم مربوط اور ایک خاص ترتیب کے سلسلے میں منسلک ہیں۔ قرآن مجید کا ہر قاری اور ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن کی نزولی ترتیب بالکل مختلف تھی، لیکن نبی اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم اور حضرت جبرئیل کی رہنمائی میں جس ترتیب سے قرآن حکیم کو مرتّب فرمایا اور اُمّت کے حوالے کیا وہ یہی ہے جو ہمارے پاس موجود ہے اور یہ لوحِ محفوظ کی ترتیب کے عین مطابق ہے۔ گویا یہی قرآن کی ازلی و ابدی ترتیب

ہے! اس حقیقت کو اصطلاحاً ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے کہ مصحف کی یہ ترتیب "توقیفی" ہے' یعنی جس کا علم نبی اکرم ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ اس لئے کہ مصحف کی یہ ترتیب خود آنحضور ﷺ نے اللہ کی اس ہدایت کے مطابق معین کی ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے سے آپؐ کو دی جاتی تھی۔ اب چونکہ اللہ حکیم ہی نہیں "احکم الحاکمین" ہے لہٰذا قرآن حکیم کا ایک نہایت گہرا اور معنی خیز باطنی نظم ہے' اگرچہ قرآن کے اس داخلی نظام اور باطنی نظم کا فہم آسان کام نہیں ہے بلکہ اس کی حکمتوں کے سمجھنے کے لئے بڑے عمیق غور و خوض اور گہرے تدبّر و تفکر کی ضرورت ہے' اور اگرچہ فہمِ قرآن کے اس پہلو پر بھی الحمدللہ ہر دور میں مفید کام ہوتا رہا ہے لیکن قرآن مجید کے محاسن و عجائب' اس کے علوم و معارف اور اس کے حِکَم و عبر ایک اتھاہ سمندر کے مانند ہیں جو تا قیامِ قیامت کبھی ختم نہیں ہو گا۔ چنانچہ نظمِ قرآن کے ضمن میں بھی عہدِ حاضر کے ایک محققِ قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے ان کی جانب پہلے توجہ نہیں ہو سکی تھی اور یقیناً آئندہ بھی اس کے مزید پہلو روشن ہوتے رہیں گے' لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ جہاں تک انسانی زندگی کی عملی رہنمائی کا تعلق ہے اس کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید نہایت سہل اور آسان کتاب ہے' جیسا کہ سورۃ القمر کی چار آیات (۱۷' ۲۲' ۳۲' ۴۰) میں اللہ تعالیٰ نے بتکرار و اعادہ ارشاد فرمایا :

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾

"اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو نصیحت اخذ کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا؟"

تیسری بات ابتدائی مکّی سورتوں کے مخصوص امتیازی اسلوب و انداز سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ مکّی دور کے بھی آخری حصّے میں جو سورتیں نازل ہوئیں' ان کا اسلوب ابتدائی مکّیات سے مختلف اور مدنی سورتوں کے اسلوب سے مشابہ ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ "رنگِ دگر" زیادہ پختگی اور گہرائی کے ساتھ مدنی سورتوں ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدائی مکّیات اور بعد کی سورتوں کے مابین جو فرق و تفاوت ہے' اس کو یوں سمجھئے کہ ابتدائی مکی سورتوں میں خطابت کا رنگ اور انداز نہایت نمایاں اور بہت گہرا ہے۔ چنانچہ

ان میں جوش و خروش بھی زیادہ ہے اور زجر و توبیخ اور انذار و تنبیہ بھی اس انداز کی حامل ہے جس کی بابت حالی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

چنانچہ اس کا کسی قدر اندازہ سورۂ قیامہ کے ترجمے ہی سے ہو جاتا ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ بیان خطیب نہایت پر جلال اور پر ہیبت انداز میں خطبہ دے رہا ہے۔

ابتدائی مکی سورتوں کا ایک دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی آیات چھوٹی چھوٹی ہیں' جبکہ بعد کی مکیات اور تقریباً تمام مدنی سورتوں میں آیات کا طول اور حجم مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم ایک فوری تقابل کر سکتے ہیں۔ یہ سورۂ قیامہ ہے جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک ہے جس کا ہم فی الوقت مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے متصلاً قبل ہم نے سورۂ تغابن کا مطالعہ مکمل کیا ہے جو مدنی سورت ہے' وہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس سورۂ قیامہ کے بھی دو رکوع ہیں۔ مصحف میں اگر آپ ان دونوں کے حجم کا تقابل کریں گے تو سورۂ قیامہ' سورۂ تغابن کے تین چوتھائی سے بھی کم ہے' لیکن سورۂ تغابن کی آیات کی تعداد اٹھارہ ہے اور سورۂ قیامہ کی آیات کی تعداد چالیس ہے۔ مزید برآں اکثر ابتدائی مکی سورتوں میں غنائیت اور ترنم بھی پایا جاتا۔ چنانچہ ان میں قوافی کا لحاظ بھی نمایاں ہے اور بہاؤ بھی تیز ہوتا ہے۔ اس طرح ایک جانب جوش و خروش اور دوسری جانب تیزی و روانی' ان دونوں کے امتزاج سے زبردست اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تمام اوصاف ابتدائی مکی سورتوں میں بہت نمایاں ہیں جبکہ آخری دور کی مکیات اور بالخصوص مدنی سورتوں میں چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر آپ ایک مختلف انداز اور رنگ پائیں گے' چنانچہ ان میں آیات بھی طویل ہو گئی ہیں' بہاؤ بھی تیز نہیں ہے بلکہ مضمون بڑے پر سکون انداز میں بالکل ایسے آگے بڑھتا ہے جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ آیات کی طوالت کے باعث عام طور پر ان میں قوافی (فواصل) اور صوتی آہنگ کا بھی اتنا اہتمام نہیں رہتا جو ابتدائی مکیات کا خصوصی وصف ہے۔

سورۂ قیامہ کے حوالے سے قرآن حکیم کے عظیم معجزہ ہونے کا ایک یہ پہلو بھی

باآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی زبان و ادب کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ قرآن مجید کا عربی زبان پر یہ عظیم احسان تو بالکل ظاہر وباہر ہے کہ مختلف علاقائی "بولیوں" سے قطع نظر ادبی اور کتابی عربی کی روایت کا تسلسل اسی کے دم سے قائم و دائم ہے' اور اس طرح قرآن حکیم عربی زبان کو گویا ایک ستون کی مانند تھامے ہوئے ہے۔ چنانچہ اب بھی عربی ادب میں قرآن مجید کو بالکل وہی مقام حاصل ہے جو اس کے نزول کے وقت تھا' اور اس کی بنیاد کسی مذہبی عقیدے یا عصبیت پر قائم نہیں ہے' اس لئے کہ کثیر تعداد میں ایسے یہود و نصاریٰ آج بھی موجود ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ قرآن حکیم کے اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے لیکن بایں ہمہ وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی ادب کا شاہکار ہے اور قرآن مجید کے اس وصف کے بارے میں ان کو بھی کوئی اشتباہ نہیں ہے' اور اگرچہ یہ بات تو بہت تفصیل طلب ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مستقل اور وسیع موضوع ہے کہ قرآن حکیم کے اعجاز کے کون کون سے رخ اور کون کون سے پہلو ہیں اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے معانی' اس کے مطالب' اس کے مفاہیم' اس کا طرز استدلال' اس کی اثر انگیزی' اس کی علمی رہنمائی' اس کی روحانی و اخلاقی تعلیم' پھر انسان کے پیچیدہ ترین عمرانی اور تمدنی مسائل کا جو متوازن و معتدل حل یہ پیش کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے جو کامل اور عدل و قسط پر مبنی دستور یہ عطا فرماتا ہے وہ سب اپنی جگہ اعجاز قرآنی کے اہم اور عظیم مظہر ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرے گا اور نئے نئے حالات و واقعات سامنے آئیں گے اعجاز قرآنی کے یہ پہلو مزید اجاگر ہوں گے' لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت اس کے اعجاز کا جو پہلو سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا تھا وہ ہے اس کا اسلوب' ادبیت' خطابت' فصاحت' بلاغت' سلاست' حلاوت' تر و تازگی' چاشنی اور اس کا جوش و خروش! ـــــ اور اس کے یہ تمام محاسن تا حال اسی طرح آفتابِ عالم تاب کی مانند قائم ہیں اور بحمدِ اللہ قرآن حکیم کے بارے میں ہر صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ آج بھی نبی اکرم ﷺ کے یہ ارشادات صد فیصد درست اور ہر شائبہ شک سے پاک ہیں کہ : ((لَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ' وَلَا

یَخْلُقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ' وَلَا تَنْقَضِی عَجَائِبُہٗ)) یعنی "اہل علم اس سے کبھی سیر نہ ہو سکیں گے' اور اس پر کبھی باسی پن طاری نہیں ہو گا' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف اور اثر انگیزی میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہو گا"۔ گویا یہ قرآن مجید اور فرقان حمید ہمیشہ اسی طرح تابندہ' پائندہ اور تر و تازہ کلام رہے گا جس طرح اپنے نزول کے وقت تھا اور اگرچہ قرآن مجید کے یہ ادبی محاسن اس کے ایک ایک لفظ میں نمایاں ہیں لیکن ان کا جس شدت کے ساتھ ظہور ابتدائی مکی سورتوں میں ہوا ہے اس کا ادراک اور شعور تو ہم غیر عرب عامیوں کو بھی بہت حد تک ہو جاتا ہے' اور چونکہ سورۃ القیامہ اس کی ایک نہایت نمایاں مثال ہے لہٰذا اس سورۂ مبارکہ کے ضمن میں اس تمہیدی گفتگو میں قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور بالخصوص ابتدائی مکی سورتوں اور بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کے مابین انداز اور اسلوب کے فرق کی جانب یہ اشارات کر دیئے گئے۔ اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ (جاری ہے)

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Annual Subscription in Pakistan: Rs. 100/-
Price per issue: Rs. 30/-

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore
36-K. Model Town. Lahore-54700 Phone: 5869501-3; Fax: 5834000
E-Mail: anjuman@brain.net.pk

اسلام اور شخصیت پرستی

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

شخصیت پرستی انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے۔ اسی کی انتہائی صورت بت پرستی ہے۔ شخصیت پرستی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ عجلت پسندی، سہل انگاری اور حصول مقصد کے لئے ہر حربہ اختیار کر لینا بھی انسانی کمزوریاں ہیں، جن کو توازن اور اعتدال پر رکھنا بڑے عزم کی بات ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ دنیا میں مقصد براری کے لئے صرف وہی وسائل اختیار کئے جائیں جو جائز اور مستحسن ہوں۔ غلط وسائل اگرچہ حصول مقصد کے لئے کتنے ہی مناسب نظر آئیں اختیار نہ کئے جائیں۔ اصل میں اسی فرق و امتیاز کو پیش نظر رکھ کر عمل کرنا مطلوب ہے۔ قرآن شریف میں آتا ہے :

﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾

"اللہ نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھا عمل کرتا ہے"۔

اگرچہ ایمان بالآخرت بنیادی اسلامی عقائد میں سے ہے مگر دنیا کا عیش و آرام اور نقد سہولتیں اسے وقتی طور پر ذہن سے بھلا دیتی ہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود انسان وہ کام کر گزرتا ہے جو آخرت کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ پھر ابلیس تو ہر وقت برائی کو خوش نما بنا کر پیش کرتا ہے۔ شیطان کو قرآن شریف میں "غَرُور" بھی کہا گیا ہے جس کا معنی ہے دھوکہ باز اور جلد باز۔ انسان بہت جلدی شیطان کے دھوکہ میں آ کر غلط کام کر گزرتا ہے اور خدائی امتحان میں ناکام اور نامراد ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں صلاحیتوں کے ساتھ پیدا نہیں کیا۔ بعض لوگ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، پھر وہ مزید محنت و ریاضت کے ساتھ معاشرے میں ایک امتیازی مقام بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا اور دائرہ اعتدال میں رہتے ہوئے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا درست ہے مگر ایسے

لوگوں کو دائرہ انسانیت سے ماوراء (Super man) سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے۔ اچھے ڈاکٹر' قابل انجینئر' لائق استاد' عالم باعمل' ماہر کاریگر' کامیاب ہوا باز' بلاشبہ قابل عزت و تکریم بھی ہیں اور ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ بھی اٹھانا چاہئے۔ مگر ان کو انسانی کمزوریوں سے بالا سمجھ کر ان کے سامنے جھک جانا اور اپنی ذات کی تذلیل کرنا ہرگز روا نہیں۔ وہ تو خدائے واحد کی ایک اور صرف ایک ذات ہے جس کے سامنے خشوع و خضوع اور تذلل جائز ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیائے کرام انسانیت کی عظمت اور بلندی کے انتہائی مقام پر ہوتے ہیں اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود اسلام میں اس بات کی ہرگز گنجائش موجود نہیں کہ انہیں پرستش کا حق دار سمجھا جائے۔ قرآن شریف میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ..... ﴾ (آل عمران : ۷۹)

"کسی آدمی کا یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب' حکمت اور نبوت عطا فرمائے' پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ اللہ کو چھوڑ کر' بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ) تم اللہ والے ہو جاؤ"۔

پھر اسلام نے ہمیں صرف نظریاتی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ رسول پاک ﷺ کو اس تعلیم پر عمل کا نمونہ بنا کر بھی پیش کیا۔ قرآن میں ہے ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ "بے شک اللہ کے رسول ﷺ (کی زندگی) میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے"۔ آپ ؐ اپنے وقت کے سب سے زیادہ قدر و منزلت کے حامل انسان تھے۔ آپ ؐ عظمت کے انتہائی مقام پر فائز تھے۔ آپ ؐ خدا کے محبوب اور انسانوں کے ہادی تھے۔ اس کے باوجود آپ ؐ نے صحابہ کرام ؓ کو اپنے سامنے جھکنے یا بچھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لئے حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام ؓ میں سے کسی نے آپ سے عرض کیا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ کو سجدہ کریں

مگر آپؐ نے پوری شدت کے ساتھ وضاحت کردی کہ ہرگز نہیں' سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ جب رسول پاک ﷺ نے اپنی پرستش کی اجازت نہیں دی تو انسانوں میں آپؐ سے بڑا کون ہے جن کی پرستش کی جائے۔ پس پرستش کے لائق تو فقط وہی ایک ہے جو کائنات کا خالق و مالک ہے' حیّ و قیوم ہے' جس کو بقا ہے فنا نہیں' جو ہر طرح کی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری (weakness) سے منزّہ و مبرّا ہے۔ بلکہ آپؐ نے اپنے عمل سے بتادیا کہ پرستش تو میں بھی صرف اسی خدائے واحد کی کرتا ہوں اور آپؐ بھی صرف اسی کی پرستش کریں۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ اس ضمن میں روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آپؐ اللہ کی عبادت میں دن رات لگے رہتے تھے' آپ کے دن کے عمل بھی عبادت تھے اور رات کا قیام و سجدہ بھی عبادت تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا آپؐ اللہ کے محبوب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معراج سے نوازا اور قیامت کے روز مقامِ محمود پر فائز کرے گا مگر اس کے باوجود آپ نے اپنے کسی عقیدت مند یا رشتہ دار کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ عمل سے غافل رہے اور رسول کی نری محبت یا رسول سے خونی رشتہ ہی کو اپنی نجات کے لئے کافی سمجھے۔ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا "اے قریشیو! اپنی خبر لو۔ میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عبدِ مناف! میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبدالمطّلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے صفیہؓ رسولِ خدا کی پھوپھی! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے محمد کی بیٹی فاطمہ! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا"۔ ایک بار حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو برا نہ معلوم ہو گا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی بیٹی کے گلے میں آگ کا ہار ہے۔

یہاں قارئین کی توجہ مسئلہ شفاعت کی طرف مبذول ہو گی۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ بلاشبہ رسولِ پاکؐ کی شفاعت امّت کے گناہ گاروں کے بارے میں حق ہے مگر وہ ایک اعزاز ہے جو رسول اکرم ﷺ کو دیا جائے گا اور آپؐ صرف ان لوگوں کے حق میں شفاعت کریں گے جن کے لئے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور جن کی بخشش کرنا چاہے گا۔ آج کسی فردِ بشر کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ معلوم کر سکے کہ اس کے

بارے میں رسول پاک ؐ کو شفاعت کا اذن دیا جائے گا۔ شفاعت کے بارے میں یہی نقطہ نظر صحابہ کرام ؓ کا تھا۔ اسی لئے وہ لوگ ہمہ وقت نیک اعمال میں منہمک رہے اور نظریۂ شفاعت نے ان کے اندر کسی بھی درجے میں بے عملی اور کوتاہی پیدا نہیں کی' ورنہ رسول پاک ؐ کے ہمہ وقت ساتھی ہونے کے ناطے وہ آپ ؐ کی شفاعت کے اولین امیدوار ہونے کے بجائے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالتے اور مشقت اور تکلیف کے بجائے آرام و راحت کی زندگی بسر کرتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبریں پختہ بنانے سے منع فرمایا۔ اس میں بھی اسی بات کی پیش بندی کی گئی ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کی قبریں اگر باقی رہیں گی تو شخصیت پرستی کے جذبے کے تحت لوگ ان قبروں کے ساتھ وابستگی رکھیں گے اور طرح طرح کے خرافات میں لگ جائیں گے۔ اسی طرح کسی خاص قبر کی زیارت کے لئے سفر کرنا آپ ؐ کے اسوۂ حسنہ میں نظر نہیں آتا۔ خود عرب کے اندر شہر جدّہ میں اماں حوا کی قبر بتائی جاتی ہے مگر آپ ؐ کا جدّہ کی طرف سفر بغرضِ زیارت ثابت نہیں ہے۔ آپ ؐ کی زندگی میں آپ ؐ کے بیٹے فوت ہوئے' بیٹیاں فوت ہوئیں' دیگر رشتہ دار اور دوست فوت ہوئے مگر آپ ؐ نے کسی کی قبر کو پختہ نہیں کیا اور نہ باقی رکھنے کی ہدایت کی۔ ہاں قبرستان میں جانا' اہل قبور کی مغفرت کے لئے دعا کرنا اور اپنی موت کو یاد کرنے کا عمل نہ صرف آپ ؐ سے ثابت ہے بلکہ اس کا آپ ؐ نے حکم دیا ہے۔

شخصیت پرستی انسان کو فریب نفس میں مبتلا کر کے شرک کی نجاست سے آلودہ کر دیتی ہے۔ جبکہ شخصیت پرستی سے کامل اجتناب نہ صرف توحید پر پختہ یقین اور اسوۂ حسنہ کی پیروی میں مستعدی پیدا کرتا ہے بلکہ امّت کے اندر افتراق و انتشار اور فرقہ پرستی کو ختم کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ فرقوں کی بنیاد عموماً مختلف نامور اشخاص کے ساتھ حد درجہ وابستگی پر قائم ہو گئی ہے۔ جب امّت کے تمام افراد امت کے نیک اور صالح افراد کے ساتھ یکساں وابستگی رکھیں' ان کی تحقیقات اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں' مگر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کو مطاع نہ سمجھیں' یعنی واجب الاطاعت ہستی بلا اختلاف رسول اللہ ﷺ کی ہی تسلیم کریں تو جھگڑے ختم اور فرقے بھی ختم۔ اور یہی حکم اللہ تعالیٰ

کا ہے : ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ "پس اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو"۔ یعنی قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ سے اس کا حل تلاش کرو۔ پس یہی دو چیزیں اتحاد و اتفاقِ امت کی بنیاد ہیں۔ قولِ رسولؐ اور آیتِ قرآن کے مقابلے میں کسی دوسرے شخص کی تحقیق کو اہم سمجھنا نہ صرف نادانی' جہالت اور گمراہی ہے بلکہ امت کے اندر انتشار و افتراق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کا مشہور قول ہے کہ رسول پاکؐ کے فرمان کے مقابلے میں میری بات کو ترک کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود امام صاحب تلقین کر رہے ہیں کہ میری تحقیقات سے فائدہ تو اٹھاؤ مگر آنکھیں بند کر کے نہیں' کیونکہ قول فیصل میری بات نہیں بلکہ فرمانِ رسول ﷺ ہے۔ قریب قریب یہی بات اُمّت کے صلحاء نے بھی کہی ہے۔ کسی نے اپنی بات کو اس انداز میں پیش نہیں کیا کہ اسے حرف آخر سمجھ کر قبول کیا جائے۔

اگر آج ہم لوگ صلحائے امت میں سے کسی ایک دو کا انتخاب نہ کریں بلکہ سب لوگوں کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں۔ جن بزرگوں کے ساتھ کسی شخص کو زیادہ نسبت ہو جائے وہ دوسرے لوگوں کو اس بزرگ کے ساتھ ویسی ہی نسبت رکھنے پر مجبور نہ کریں بلکہ ان کی دوسرے بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور محبت کو برداشت کریں تو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی طرف مثبت پیش رفت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بزرگوں کی قبروں کے ساتھ اگر وہی معاملہ کیا جائے جو سنّتِ مطہرہ سے ثابت ہے تو قبر پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور یہی ہمارے لئے راہِ صواب ہے۔ آپؐ نے اپنی آخری بیماری کے دوران فرمایا کہ "لوگو! تم میری قبر کو صنم نہ بنانا۔ یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا تھا۔"

پس آج مسلمانوں کو چاہئے کہ شخصیت پرستی اور قبر پرستی کو چھوڑ کر اسوۂ حسنہ کو دل و جان سے فیصلہ کن تسلیم کریں اور اس کے بدلے میں اتفاق و اتحاد کی نعمت سے بھی حظ اٹھائیں اور اپنی عاقبت بھی سنوار لیں۔

"حکمتِ قرآن اسم بامسمّیٰ ہے"

مکرمی جناب مدیر حکمت قرآن' السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

"خطوط و نکات" کے عنوان سے ماہ اکتوبر نومبر کے شمارے میں محمد شریف حافظ صاحب کے مکتوب گرامی کی اشاعت سے تحریک پیدا ہوئی اور میں بھی چند حروف لئے حاضر ہو رہا ہوں۔ بہت سے دوسرے رسائل کی طرح کیا ہی اچھا ہو کہ ماہنامہ حکمت قرآن میں بھی دو یا تین صفحات قارئین کی تجاویز و آراء کے لئے بھی مختص ہوں۔ اس طرح سے جہاں ایک طرف رسالے کو سجانے' سنوارنے اور نکھارنے میں قارئین کی تجاویز سے استفادہ ممکن ہو سکتا ہے وہاں دوسری طرف قارئین میں رسالے سے اجنبیت کے بجائے اپنائیت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ ان مختص صفحات میں رسالے میں چھپنے والے مواد پر تعریف و تنقید نئے لکھاریوں کے لئے تسلی' حوصلے اور اصلاح کا باعث ہو گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بزم کے شرکاء میں ایک غیر مرئی تعلق پیدا ہو جائے گا جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے اساسی مقصد کے حصول کے لئے بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہو گا۔

حکمت قرآن میں شائع ہونے والے مضامین بلند پایہ اور معیاری ہوتے ہیں اور آپ اس خوش رنگ گلدستے کو جس خوبصورتی سے سجاتے ہیں اس پر میں آپ کو اور آپ کی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یقیناً حکمت قرآن اسم بامسمیٰ ہے' اس سے واقعی قرآنی حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس مادیت پرستی اور جاہ طلبی کے دور میں بڑے عظیم ہیں وہ لوگ جو رب کے قرآن کی نوکری چاکری میں لگے ہوئے ہیں اور قابل تحسین ہیں محترم امیر تنظیم اسلامی جنہوں نے ان کے اذہان و قلوب میں عشق قرآن اور خدمت کلام رحمان کی شمع فروزاں فرمائی۔

"پیکر رحمت ﷺ کا غصہ" کے عنوان سے بھیجے گئے میرے مضمون کو حکمت قرآن کے قیمتی صفحات میں جگہ دینے پر میں آپ کا ممنون ہوں' امید ہے آئندہ بھی آپ کی حوصلہ افزائی شامل حال رہے گی۔ اگر مناسب سمجھیں تو اس مکتوب کو شائع فرمادیں۔ والسلام

قاری ظہیر احمد عباسی
تحصیل مری۔ ضلع راولپنڈی

عصری مسائل کا حل
سیرت طیبہ کی روشنی میں (۲)

ممتاز احمد اعوان ☆

ii) سیاسی عدم استحکام

ہمارے موجودہ مسائل میں ایک اہم مسئلہ سیاسی عدم استحکام ہے۔ اس عدم استحکام کا سبب سیاسی کارکنوں کی عدم رواداری، پُر تشدد اور غیر متوازن رویّہ ہو یا حکومت کی جانب سے لوگوں کے حقوق کی عدم ادائیگی، ہر دو صورتوں میں ملکی معیشت اور ترقی پر منفی اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں اس مسئلے کا بڑا متوازن حل موجود ہے۔ آپؐ نے سیاسی کارکنوں کو بڑے سخت الفاظ میں متنبہ فرمایا ہے کہ وہ آئے دن حکومت کو کمزور کرنے کے لئے مظاہرے اور پُر تشدّد پالیسی اختیار نہ کریں۔ اس سلسلے میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انہیں حتی المقدور حکومتِ وقت کی اطاعت کرتے رہنا چاہئے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہر روز انارکی پیدا کی جائے گی اور ملک غیر مستحکم ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے چند ارشادات گرامی ملاحظہ ہوں:

۱) "اگر تمہارے اوپر کسی نکٹے حبشی غلام کو بھی حاکم بنا دیا جائے اور وہ تمہیں کتاب اللہ کے مطابق حکم دے تو تم اس کی اطاعت کرو اور اس کا حکم مانو"۔ {۱۹}

۲) "حاکم کے حکم کو سننا اور اطاعت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے خواہ وہ حکم تمہیں پسند ہو یا ناپسند، جب تک کہ وہ تمہیں گناہ کا حکم نہ دے اور جب وہ گناہ کا حکم دے تو تم پر اس کی اطاعت لازم نہیں"۔ {۲۰}

☆ اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج پیپلز کالونی گوجرانوالہ

۳) ''تم میں سے جو شخص حاکم کی طرف سے ایسی کوئی چیز دیکھے جو اسے ناگوار ہو تو صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور اسی حال میں فوت ہوا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''{۲۱}

۴) نبی کریم ﷺ نے فرمایا : ''تمہارے حکمران اچھے کام بھی کریں گے اور بُرے بھی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم انہیں ٹوکو۔ جس نے ایسا کر دیا تو گویا وہ اپنے فرض سے بری ہو گیا۔ ایسا شخص جو انہیں ٹوک تو نہ سکا لیکن انہیں دل سے برا کہتا رہا وہ بھی بچ گیا۔ لیکن جس شخص نے ان سے اتفاق کیا اور ان کے برے افعال کی پیروی کی وہ شخص گناہ میں شریک ہو گیا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ کیا ہم ان سے لڑیں؟ آپؐ نے فرمایا : ''نہیں جب تک کہ وہ نماز ادا کرتے رہیں۔'' ایسا آپؐ نے دو مرتبہ فرمایا۔ {۲۲} نماز پڑھنا در حقیقت اس بات کا اظہار ہو گا کہ وہ کھلم کھلا دین سے برگشتہ نہیں ہوئے اور دین کی وقعت ان کے دلوں میں موجود ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے۔ آپؐ نے حکمرانوں کو بھی سخت الفاظ سے متنبہ کیا ہے کہ لوگ تو ان کی اطاعت کریں گے لیکن اس اطاعت کو وہ اپنے اقتدار کی مضبوطی اور طوالت کے لئے استعمال نہ کرنے لگیں' بلکہ اگر انہوں نے ان کے حقوق ادا نہ کئے تو وہ بہت بڑے خائن اور بد دیانت شمار ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ نے قومی یکجہتی' داخلی استحکام اور مملکت کی مضبوطی کے لئے جہاں عوام کو پابند کیا ہے کہ وہ حتی المقدور سربراہ حکومت یا مملکت کی اطاعت کریں وہاں انہیں کلمۂ حق بڑی جرأت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ {۲۳} کلمۂ حق بلند کرنے کا حق بھی در حقیقت مملکت کی مضبوطی کے لئے ناگزیر ہے ورنہ حکومت آمرانہ رجحانات کی جانب چل پڑتی ہے اور سیاسی نظام تباہ ہو جاتا ہے۔

داخلی استحکام کی خاطر نبیؐ کریم ﷺ نے عوام کو اطاعت کا خوگر بنایا تو دوسری جانب حکمرانوں کو بھی خبردار کیا کہ وہ عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔ معقل بن یسارؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ :

''جس بندہ کو اللہ تعالیٰ نے رعیت کی نگہبانی سپرد کی اور وہ بھلائی اور خیر خواہی کے

ساتھ یہ فرض پورا نہ کرے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا"۔ {۲۴}

اسی صحابیؓ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

"جو شخص مسلمانوں کی سرداری کو اپنے ہاتھ میں لے اور اس حال میں مرے کہ وہ خائن اور ظالم ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دے گا"۔ {۲۵}

نبی کریم ﷺ نے ظالم حکمرانوں کو بدترین حاکم قرار دیا۔ {۲۶} نبی کریمؐ نے یہ دعا فرمائی کہ "اے اللہ جو حکمران میری امت کو مشقت میں ڈالے تو بھی اسے مصیبت و مشقت میں ڈال اور جو نرمی کرے تو بھی اس کے ساتھ نرمی کر"۔ {۲۷}

اسی طرح نبی کریمؐ نے یہ ارشاد بھی فرما دیا کہ مملکت کی مضبوطی کی خاطر اگرچہ حکمران کی اطاعت بڑی اہم ہے تاہم ان کی اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے اور مخلوق کی اطاعت اس صورت میں جائز نہیں کہ اس میں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو۔ {۲۸}

نبی کریم ﷺ نے ایک جانب یہ فرمایا کہ :

"جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اس جس نے میری اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی۔" {۲۹}

لیکن دوسری طرف پوری طرح اظہار رائے کی آزادی بھی دی ہے۔ اگر حکمران کھلم کھلا ایسی روش اختیار کر لیں جس سے کفر کا اظہار ہوتا ہو تو اس صورت میں ان کا حکم نہیں مانا جائے گا {۳۰}۔ اگرچہ ایک طرف یہ حدیث موجود ہے کہ صحابہ کرامؓ رسول اللہؐ کے دست اقدس پر خوشی' غمی' سختی اور آسانی میں حاکم کی اطاعت کی بیعت کیا کرتے تھے {۳۱} لیکن ساتھ ہی روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ ہم اس بات پر بیعت کیا کرتے تھے کہ "ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا کئے بغیر ہمیشہ سچ ہی کہیں گے"۔ {۳۲} اس طرح آپ ﷺ نے دونوں فریقوں کو اختیارات دیئے ہیں تاکہ آمریت بھی جنم نہ لے اور سیاسی کارکن انارکی بھی نہ پھیلاتے پھریں۔

iii) کمزور طبقہ کے بارے میں حکمرانوں کا غیر مناسب رویّہ

ہر ملک کی آبادی کا بالعموم ایک غالب حصہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اس ملک کے وسائل معیشت کو ترقی دینے میں عملی کردار ادا کرتا ہے لیکن کم آمدنی اور محدود

وسائل کی وجہ سے اس کی آواز میں وہ "سیاسی زور" نہیں ہوتا جو ایک جاگیردار یا اعلیٰ عہدے پر فائز سرکاری افسر کی آواز میں ہوتا ہے۔ وہ ملک کو کما کر دیتا تو ہے لیکن وہ خود دو وقت کی روٹی کے لئے ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ اس سے ووٹ لینے کے لئے اس کا نام اچھال کر سیاست دان اپنی دکان چمکاتے تو ہیں لیکن اس کی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آتا۔ یہ طبقہ عموماً محرومیوں کے احساسات تلے دبا رہتا ہے۔ یہ لوگ اگر اس احساس محرومی کو اپنے اوپر مسلّط کرلیں تو ملک کا معاشرتی اور سیاسی نظم درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اس لئے ایک کامیاب نظام کی خصوصیت یہ ہونی ضروری ہے کہ وہ اس محنت کش طبقے کی آواز کو جائز مقام دے اور اسے محض انتخابی مہم کا نعرہ نہ بنائے۔

نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر اس طبقہ کو اس کا محترم مقام دیا۔ آپؐ غریبوں میں بیٹھنا' ان سے باتیں کرنا اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونا پسند فرماتے۔ طبرانی کی روایت ہے :

((کان یاتی ضعفاءَ المسلمین ویزورھم ویعود مرضاھم ویشھد جنائزھم)) {۳۳}

(نبی کریم ﷺ) کمزوروں کے پاس تشریف لے جاتے' ان سے ملاقات فرماتے' مریضوں کی عیادت فرماتے اور ان کے جنازوں میں شرکت فرماتے۔"

آپ ﷺ نے غریبوں کو احساس دلایا کہ اگرچہ معاشرے کے لوگ ان کی ظاہری ہیئت کی وجہ سے انہیں زیادہ وقعت نہیں دیتے لیکن اللہ کے ہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے {۳۴}۔ آپؐ کے متعدد ارشادات گرامی ہیں کہ اللہ تعالیٰ غریبوں اور ضعیفوں کی وجہ سے امیروں کو رزق عطا فرماتے ہیں {۳۵}۔ آپؐ نے فرمایا کہ غرباء' امیروں کے مقابلے میں چالیس برس پہلے جنت میں جائیں گے {۳۶}۔ آپؐ نے فرمایا میں نے معراج کی رات جنت میں جھانک کر دیکھا تو مجھے وہاں زیادہ تر غرباء ہی دکھائی دیئے۔ {۳۷} ایک حدیث میں فرمایا گیا : تم میری رضامندی کو اپنے ضعیفوں میں تلاش کرو۔ {۳۸} خندق والے دن کھدائی کرتے ہوئے لوگوں نے بھوک کی شکایت کی۔ رحمتِ عالم ﷺ نے جو خود بھی کھدائی میں شریک تھے' اپنے بطن مبارک سے بندھے ہوئے دو پتھر دکھائے۔ {۳۹} یہی

وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں غرباء نے مملکت کی بقاء واستحکام کے لئے ہراول دستے کے طور پر کام کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ معاشرے کے مؤثر اور باوقار شہری ہیں۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ امراء نے کبھی اپنے آپ میں کوئی امتیازی شان محسوس نہیں کی اور وہ غرباء کے ساتھ برابر کے شہری شمار ہوتے رہے۔ اس سے طبقاتی مسائل پیدا ہونے کا خدشہ ہی ختم ہوگیا۔

نبی کریم ﷺ نے ایک بہت بڑے خطرے اور فتنے کی جانب بھی ہمیں متوجہ فرمادیا جو یقیناً عصر حاضر میں پیدا ہو چکا ہے۔ آپؐ نے فرمایا :

((انما هلك من كان قبلكم انهم كانوا يقيمون الحد على الوضيع ويتركون الشريف والذى نفسى بيده لو فاطمة بنت محمد فعلت ذلك لقطعت يدها)) {۴۰}

"بے شک تم سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے کہ وہ کم مرتبہ لوگوں پر تو حدیں لاگو کردیتے تھے لیکن بااثر لوگوں کو چھوڑ دیتے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی اس جرم کا ارتکاب کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔"

ظلم ہر دور کا بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ ظلم یہ ہے کہ حق دار کی بجائے حق دوسرے شخص کو دے دینا۔ اس کے برعکس عدل ہے' جس کا معنی ہے حق دار کو حق دینا۔ اسلام تو آیا ہی اس لئے تھا کہ وہ معاشرتی' معاشی اور سیاسی شعبوں سے ظلم کا خاتمہ کرے۔ نبوت' کتاب اور عدل و انصاف کی میزان کا قرآن مجید نے ایک ساتھ ذکر کر کے ہمیں بتایا ہے کہ نبوت اور کتاب کے نزول کا مقصد اسی وقت مکمل ہوگا جب کتاب کی روشنی میں لوگوں کو ان کے حقوق ملیں۔ ظلم کی مذمت کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

i) ((الظلم ظلماتٌ يومَ القيامه)) {۴۱}

"ظلم قیامت کے اندھیروں میں سے اندھیرے کی ایک شکل ہوگی۔"

ii) ((اتق دعوة المظلوم فانها ليس بينها وبين اللّٰه حجابٌ)) {۴۲}

"مظلوم کی دعا سے بچو کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔"

iv) جہالت اور سیرتِ طیّبہ میں اس کا حل

جہالت دورِ حاضر کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ ہر حکومت کے بنیادی اہداف میں فروغ تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اقوام متحدہ کے بنیادی پروگراموں میں فروغ تعلیم کے لئے مختلف ممالک کو مالی اور فنی امداد مہیا کرنا بھی شامل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس ضرورت کو آج سے صدیوں قبل محسوس فرمایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کے کتنے ہی ناگفتہ بہ حالات اور دشمن کی ہر لحہ معاندانہ حرکتوں اور سازشوں کے باوجود آپؐ نے علم اور فروغ علم کا اہتمام فرمایا۔ وہ قوم جو پڑھنے کے مزاج ہی سے ناآشنا تھی اسے علم کا شیدائی بنا دینا کچھ اتنا آسان کام نہ تھا۔ یہ آپؐ کی رکھی ہوئی بنیادوں کی اثر آفرینی ہی تھی کہ یہی عرب ایک دو صدیوں کے اندر اندر پوری دنیا میں علم و حکمت کے جھنڈے گاڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

اسلام سے قبل علم مخصوص طبقوں تک محدود تھا۔ ارسطو ہو یا افلاطون یا کوئی اور تمدن ہر جگہ تعلیم و تعلّم خاص لوگوں کا حق ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسلام نے علم کو ہر انسان کی ایک بنیادی ضرورت قرار دیا۔ یونان اور چین میں علمی ترقی دکھائی دیتی لیکن اہل حل و عقد تعلیمِ عامہ کے قائل نہ تھے۔ ہندوستان میں یہ حق پنڈتوں کو حاصل تھا اور شودر حصول علم کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ چند ارشادات نبوی ملاحظہ ہوں :

(i) ((طلب العلم فریضة علٰی کل مسلم))
"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"۔ {۴۳}

(ii) نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص علم کے حصول کے لئے گھر سے نکلتا ہے اس کے لئے کائنات کی تمام اشیاء دعائیں کرتی ہیں۔ عالم کو عابد پر وہی فضیلت ہے جو چودھویں رات کے چاند کو پہلی رات کے چاند پر ہوتی ہے۔ اور علماء انبیاء کے وارث ہیں"۔ {۴۴}

(iii) قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم : ((من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللّٰہ حتی یرجع)) {۴۵}
"جو شخص حصول علم کے لئے نکلا وہ اللہ کی راہ میں نکلا ہوا شخص ہے، یہاں تک کہ وہ لوٹ کر گھر آجائے"۔

(iv) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((اُغدُ عالمًا او متعلمًا او مستمعًا او محبًا ولا تکن الخامسه فتهلکَ)) {۴۵}

"تجھے اس حال میں صبح کرنی چاہئے کہ تو عالم ہو' علم سیکھنے والا ہو' علم سننے والا ہو یا علم سے محبت رکھنے والا ہو۔ اگر کوئی پانچویں صورت اختیار کی تو ہلاک ہو جائے گا۔"

(v) رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے فرمایا کہ وہ دوسری زبانوں کا علم سیکھیں۔ آپؐ نے فرمایا "زید تم میرے لئے یہودیوں کی کتاب سیکھو.... زید تم سریانی سیکھو!" زید کہتے ہیں کہ میں نے سترہ دنوں میں زبان سیکھ لی۔ {۴۷}

اس سے معلوم ہوا کہ دینی علوم کے علاوہ دیگر علوم سیکھنے کی اسلام میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

آپؐ نے علم کے فروغ پر بھی خصوصی توجہ فرمائی۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سنی' اسے یاد رکھا اور اسے دوسروں تک پہنچایا" {۴۸}۔ اس موضوع کی بہت سی احادیث کتب حدیث میں موجود ہیں۔ {۴۹}

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی"۔ {۵۰} ایک ارشاد گرامی یوں ہے : "اس شخص کی مثال جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اس نے اسے آگے نہ پہنچایا' اس شخص کی سی ہے جسے اللہ نے مال دیا ہو' اس نے اسے جمع تو کر لیا لیکن وہ اسے خرچ نہیں کرتا"۔ {۵۱} آپؐ نے علم کے فروغ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی اس کے پھیلائے ہوئے علم کا اجر و ثواب ملتا رہتا ہے۔ {۵۲} وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم سے نوازا ہو اور وہ اسے دوسروں تک پہنچاتا ہو' اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایسے شخص پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ {۵۳}

اسلامی ملکوں کے نظام تعلیم میں یہ عمومی کوتاہی پائی جاتی ہے کہ طالب علم میں تحقیق

جذبہ اور تخلیقی استعداد پیدا کرنے کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ اور محض اقوال و آراء ازبر کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ طالب علم اپنی معلومات کے بل بوتے پر امتحان میں اپنی حیثیت تسلیم کروا لیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے دیئے ہوئے تصور علم میں اس کمزوری کا علاج موجود ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ بات کی تہہ تک پہنچو اور اس کی حقیقت کو پاؤ۔ اس سلسلے میں آپ ؐ نے ہمیں یہ دعائیں تعلیم فرمائیں :

((اللھم ارنا حقیقۃ الاشیاءِ کما ھی)) {۵۴}

"اے اللہ تو ہمیں اشیاء کی حقیقت دکھا جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں"۔

اسی طرح آپ ؐ نے علم نافع کا تصور دیا۔ ایسا علم جس سے دین و دنیا کا کوئی فائدہ نہ ہو اس سے آپ نے پناہ مانگی۔ آپ ؐ نے فرمایا :

((اللھم انی اعوذ بک من علمٍ لا ینفع)) {۵۵}

"اے اللہ میں غیر نفع بخش علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

اس کے ساتھ آپ ؐ نے یہ دعا تعلیم فرمائی :

((اللھم انفعنی بما علمتنی وعلمنی ما ینفعنی)) {۵۶}

"اے اللہ مجھے تو نے جو علم دیا اس سے فائدہ دے اور ایسا علم دے جو فائدہ مند ہو"۔

(جاری ہے)

حواشی

{۱} النساء : ۱۴' النور : ۵۱' الجن : ۲۳

{۲} النبی اولٰی بالمومنین من انفسھم....

"نبی کریم (ﷺ) تمہاری اپنی جانوں سے بھی زیادہ تم پر حق رکھتے ہیں"۔

{۳} لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم بالمومنین رءوفٌ رحیمٌ ○

"لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف انہیں گراں گزرتی ہے اور وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں۔ وہ مومنوں پر بہت شفقت کرنے والے اور مہربان

ہیں۔"

{۴} ابن عبدالبر، حافظ، جامع بیان العلم، جلد دوم، صفحہ ۱۸۰
{۵} ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، جلد اول، صفحہ ۱۴، حدیث نمبر ۴۲، ابو داؤد، جلد چہارم، صفحہ ۲۰۱
{۶} خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، جلد اول، صفحہ ۵۷، حدیث نمبر ۱۵۹
{۷} ابوداؤد، سنن ابی داؤد، جلد چہارم، صفحہ ۲۰۰، حدیث نمبر ۴۶۰۴
{۸} آل عمران : ۱۰۳
{۹} التوبہ : ۶۳
{۱۰} آل عمران : ۱۰۱
{۱۱} مسلم، الجامع الصحیح، جلد ششم، صفحہ ۲۱
{۱۲} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۲۲
{۱۳} مثلاً دیکھئے مسلم، الجامع الصحیح، جلد ششم، صفحہ ۲۰۔۲۲
{۱۴} ابوداؤد، سنن ابی داؤد، جلد چہارم، صفحہ ۳۳۱، حدیث ۵۱۱۶
{۱۵} ابوداؤد، سنن ابی داؤد، جلد چہارم، صفحہ ۳۳۱، حدیث ۵۱۱۷
{۱۶} ابوداؤد، سنن ابی داؤد، جلد چہارم، صفحہ ۳۳۱، حدیث ۵۱۱۹
{۱۷} ابوداؤد، سنن ابی داؤد، جلد چہارم، صفحہ ۳۳۲، حدیث ۵۱۲۱
{۱۸} احمد، مسند احمد، جلد چہارم، صفحہ ۱۴۵
{۱۹} مسلم، الجامع الصحیح، جلد ششم، صفحہ ۱۴
{۲۰} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۵
{۲۱} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۲۱
{۲۲} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۲۳
{۲۳} خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر ۳۵۳۴
{۲۴} مسلم، الجامع الصحیح، جلد ششم، صفحہ ۹
{۲۵} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۹
{۲۶} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۹
{۲۷} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۷
{۲۸} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۵
{۲۹} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۳
{۳۰} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۷
{۳۱} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۷
{۳۲} ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۷

{۳۳}خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، جلد دوم، صفحہ ۲۵۰ (فقراء کی فضیلت اور نبی کریم ﷺ کی معاشرت کا بیان)

{۳۴}ایضاً

{۳۵}ایضاً

{۳۶} ایضاً

{۳۷}ایضاً

{۳۸}ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۲۵۲

{۳۹} ایضاً

{۴۰} مسلم، الجامع الصحیح، جلد پنجم، صفحہ ۱۱۴۔ کتاب الحدود باب قطع السارق الشریف وغیرہ

{۴۱} بخاری، امام، الجامع الصحیح، حدیث نمبر ۲۲۷۲

{۴۲} ایضاً، حدیث نمبر ۲۲۷۳

{۴۳}ابن ماجہ، حدیث نمبر ۲۲۴، صفحہ ۸۱

{۴۴}ابن ماجہ، کتاب العلم، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر ۲۲۰، صفحہ ۸۱،
ترمذی، الجامع الصحیح، الجزء الخامس، کتاب العلم حدیث نمبر ۲۶۸۲، صفحہ ۴۸

{۴۵} ترمذی، ایضاً، کتاب العلم، باب فضل العلم، جلد پنجم، حدیث نمبر ۲۶۴۷، صفحہ ۲۹

{۴۶} علی المتقی، کنز العمال، جلد ۱۰، حدیث نمبر ۲۸۷۳۰

{۴۷}مسند احمد، جلد پنجم، صفحہ ۱۸۶

{۴۸}ابوداؤد، سنن ابوداؤد، کتاب العلم، باب فضل نشر العلم، جلد سوم، صفحہ ۳۲۲

{۴۹} ابن ماجہ، جلد اول، صفحہ ۸۰ تا ۸۹

{۵۰} ابوداؤد، سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب کراہیہ منع العلم، حدیث نمبر ۳۶۵۸، جلد سوم، صفحہ ۳۲۱

{۵۱} خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح، کتاب العلم، حدیث نمبر ۲۶۰، فصل سوم

{۵۲} مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، بحوالہ صحیح مسلم

{۵۳}مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم بحوالہ بخاری و مسلم

{۵۴}بحوالہ ابوہاجر محمد سعید، موسوعہ اطراف الحدیث النبوی الشریف، بیروت جلد دوم، صفحہ ۱۸۰

{۵۵} ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب العلم، باب انتفاع بالعلم والعمل بہ جلد اول، صفحہ ۹۲

سیرت و سوانح

امام جمال الدین زیلعیؒ

عبدالرشید عراقی

امام جمال الدین زیلعی ائمہ فحول میں تھے۔ علمائے اسلام نے ان کے حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور اتقان کا اعتراف کیا ہے۔ حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطیؒ نے ان کو مصر کے حفاظ حدیث اور نقادان فن میں شمار کیا ہے اور ان کو "اَحد الحُفّاظِ الحدیث" کا لقب عطا کیا ہے{۱}۔

امام زیلعی حدیث میں بہت باکمال تھے۔ اس فن کی طلب و تحصیل اور کتب حدیث کی جمع و تالیف سے اس فن میں ان کے علمی تبحر، وسعتِ نظر، حدیث اور تمام علوم حدیث سے ان کی مکمل واقفیت اور ان میں کامل دسترس کا اندازہ ہوتا ہے{۲}۔

امام جمال الدین زیلعی کی حدیثوں کے متون و مطالب اور ان کے طرق و اسناد پر بھی وسیع نظر تھی۔ فنِ جرح اور تعدیل میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ

> "امام زیلعی کی تخریج سے فن حدیث اور اس کی جزئیات و فروع میں ان کی وسعت علم و نظر اور اسماء الرجال میں تبحر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے"۔ {۳}

فقہ میں بھی امام زیلعی کو بہت بصیرت حاصل تھی۔ ارباب سیر اور اہل تذکرہ نے ان کا فقہ میں صاحب کمال ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ تخریج میں ان کو بہت ہی کمال حاصل تھا اور تخریج سے ان کے فقہی کمال اور علمی جلالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ

> "ابن ہمام نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں حنفی مذہب کے جو دلائل تحریر کئے ہیں وہ زیادہ تر زیلعی کی تخریج سے ماخوذ ہیں"۔ {۴}

امام زیلعی حدیث و فقہ میں زیادہ ممتاز تھے اور دونوں علوم میں ان کے علمی تبحر، مہارت اور ژرف نگاہی کی وجہ سے علمائے اسلام نے ان کو "الامام الفاضل

المحدث" اور "الفقیہ الامام" کے القاب دیئے ہیں۔ {۵}

امام جمال الدین زیلعی فقہی مذہب میں حنفی تھے اور ان کا شمار ائمہ احناف کے اجلہ علماء میں ہوتا ہے۔ ان کو اپنے فقہی مسلک میں غلو نہ تھا بلکہ انکی طبیعت میں انصاف پسندی تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کی بلندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احادیث کی شرح و توجیہ اور ان کے مباحث و مسائل کی تحقیق میں فقہی عصبیت کو راہ نہ دیتے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ

> "امام زیلعی نہایت حق گو و انصاف پسند تھے۔ ہر باب میں اپنے مذہب کے مخالفین کے دلائل بھی نہایت فراخدلی سے بیان کرتے ہیں۔ اور ان کو جو کچھ معلوم ہوتا تھا اس کو بلا ردو کد نقل کرتے تھے"۔ {۶}

امام زیلعی بڑے ستودہ صفات اور پاک طینت تھے۔ طبیعت میں نرمی، شرافت اور مروّت تھی۔ اپنی اس شرافت، حسن اخلاق، میانہ روی اور عدل پسندی کی وجہ سے ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں میں مقبول تھے۔ علمی کمالات کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت اور تقویٰ و طہارت میں بھی ممتاز تھے۔ ان کا دل رذائل سے پاک تھا۔ {۷}

امام جمال الدین زیلعی کا سن ولادت معلوم نہیں ہو سکا لیکن ان کا انتقال ۱۱/ محرم الحرام ۷۶۲ھ کو قاہرہ (مصر) میں ہوا۔ {۸}

تصنیفات

امام زیلعی کو علم و فن سے بڑا اشتغال تھا۔ ان کا زیادہ وقت مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا۔ احادیث کی تخریج میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ آپ کی تین کتابوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے :

۱۔ **مختصر معانی الآثار** : یہ امام طحاوی کی مشہور کتاب "معانی الآثار" کا مختصر ہے۔

۲۔ **تخریج احادیث الکشّاف** : اس میں علامہ زمخشری کی مشہور تفسیر کشاف کی حدیثوں اور آثار کی تخریج کی گئی ہے۔ مگر حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ جن حدیثوں کو زمخشری نے اشارتاً ذکر کیا تھا ان کی تخریج نہیں کی اور موقوف آثار و روایات سے بھی تعرض نہیں کیا گیا۔ {۹}

حافظ ابن حجر نے تخریج احادیث الکشاف کی ایک جلد میں تلخیص کی اور ایک جلد میں اس کا استدراک لکھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دونوں کتابیں چھپی ہیں یا نہیں، لیکن ان کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہیں۔ {۱۰}

۲۔ نصب الرّایہ فی تخریج الہدایہ : یہ امام جمال الدین زیلعی کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الہدایہ" کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔ ہدایہ کی اس سے عمدہ اور بہتر کوئی تخریج نہیں لکھی گئی۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں :

> امام زیلعی نے یہ تخریج لکھ کر جس طرح حنفی مذہب کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اسی طرح دوسرے فقہی مذاہب کی بھی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے کیونکہ انہوں نے صرف حنفی مسلک اور اس کے دلائل بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل، تخریجات و تفریعات بھی تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ محض حنفی مذہب و مسلک ہی کا عمدہ اور بیش قیمت ذخیرہ نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت دائرۃ المعارف اور انسائیکلوپیڈیا کی ہے، جس میں تمام ائمہ مجتہدین و فقہائے امصار کے مسالک و دلائل کی مکمل تفصیل موجود ہے۔
>
> مصنف نے جہاں اس میں حنفی ائمہ کے امہات کتب سے معلومات و مسائل نقل کئے ہیں وہیں شوافع میں بیہقی، نووی اور ابن دقیق العید، مالکیہ میں ابن عبد البر اور حنابلہ میں ابن جوزی اور ابن عبدالہادی وغیرہ اساطین مذہب کی کتابوں کے مباحث و مندرجات کا بھی منتخب حصہ شامل کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے احناف کی طرح دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس سے نقل و استفادہ کرتے رہے ہیں۔ {۱۱}

حافظ ابن حجر نے "الہدایہ فی تلخیص نصب الرایہ" کے نام سے اس کا مختصر لکھا تھا جو مطبوع ہے اور ہندوستان میں بھی دوبارہ چھپ چکا ہے۔

"نصب الرایہ فی تخریج الہدایہ" ہندوستان میں پہلی بار ۱۳۰۱ھ میں مطبع علوی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۵ء) میں مجلس علماء ڈابھیل نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا اور شروع میں ایک بہت عمدہ اور محققانہ مقدمہ اور مفید

حواشی بھی اس ایڈیشن میں شامل کئے گئے ہیں۔

حواشی

{۱} حسن المحاضرہ ' ج ۱ ' ص ۱۵۱
{۲} مقدمہ تحفۃ الاحوذی ' ص ۱۳۸
{۳} الفوائد البہیہ ' ص ۹۵
{۴} مقدمہ نصب الرایہ ' ص ۸
{۵} ذیل تذکرۃ الحفاظ ' ص ۱۲۸۔ الدرر الکامنہ ' ج ۲ ' ص ۳۱۰۔ البدر الطالع ' ج ۱ ' ص ۴۱۰
{۶} الدرر الکامنہ ' ج ۲ ' ص ۳۱۰
{۷} الدرر الکامنہ ' ج ۲ ' ص ۳۱۰
{۸} الدرر الکامنہ ' ج ۲ ' ص ۳۱۰
{۹} کشف الظنون ' ج ۲ ' ص ۳۱۴
{۱۰} تذکرۃ المحدثین ' ج ۲ ' ص ۷۰ ۴
{۱۱} تذکرۃ المحدثین ' ج ۲ ' ص ۷۱ ۴

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت

رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد ۸۰ روپے ■ غیر مجلد ۶۰ روپے

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

آیات ۱۰۴-۱۰۵

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱، الاعراب کیلئے ۲، الرسم کیلئے ۳ اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۶۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○

۲ : ۶۳ : ۱ اللغة

[يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا.....]

① "یٰاَیُّھَا" --- (اے) یہ "یا + ایُّ + ھا" کا مجموعہ ہے جو مل کر حرفِ ندا "یا" کا ہی کام دیتا ہے' البتہ اِس کے استعمال میں مذکر مؤنث کی تمیز الگ الگ صورتِ کلمہ سے کی جاتی ہے۔ اِس مجموعی کلمہ (یا ایھا) کی مفصل لغوی نحوی بحث البقرۃ :۲۱ [۲:۱۶:۱ (۱)] میں گزری تھی۔

② "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (وہ لوگ جو ایمان لائے)۔ اِس کے ابتدائی اسم موصول (الذین) کے استعمال اور املاء وغیرہ پر الفاتحہ :۷ [۱:۶:۱ (۱)] میں بات ہوئی تھی۔ اور "آمنُوا" کے باب مادہ' معنی وغیرہ کے لئے دیکھئے البقرہ :۳ [۲:۲:۱ (۱)]۔ یہی پوری ترکیب (الذین آمنوا) پہلی دفعہ البقرہ :۱۴ [۲:۱۱:۱ (۱)] میں گزری ہے۔ یہاں شروع میں حرفِ نداء (یا ایھا) لگنے سے اِس کا ترجمہ بصورتِ خطاب ہوگا "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو"۔ اسی کا شستہ ترجمہ "اے ایمان والو" کیا جا سکتا ہے۔

③ "لَا تَقُوْلُوْا" (تم مت کہو' تم نہ کہو) یہ فعل (قَالَ یَقُوْلُ) (کہنا) سے فعل نہی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اِس فعل کی لغوی وضاحت البقرہ :۸ [۲:۷:۱ (۵)] میں گزری ہے۔ "لَاتَقُوْلُوْا" کا وزنِ اصلی "لَا تَفْعُلُوْا" اور شکل اصلی "لَاتَقْوُلُوْا" تھی' جس میں متحرک حرفِ علت کی حرکت اس سے ماقبل ساکن حرفِ صحیح کو دے دی جاتی ہے اور اِس سے فعل نہی کی گردان "لَاتَقُلْ' لَا تَقُوْلَا' لَا تَقُوْلُوْا' لَاتَقُوْلِیْ' لَاتَقُوْلَا اور لَاتَقُلْنَ" ہوگی۔

④ [رَاعِنَا] اِس میں آخری "نَا" تو ضمیر منصوب (بمعنی "ہم کو' ہمیں") ہے اور ابتدائی لفظ "رَاعِ" کا مادہ "ر ع ی" اور وزن اصلی "فَاعِلْ" ہے۔ یعنی یہ بابِ مفاعلہ سے فعل امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ اِس کی اصلی شکل "رَاعِیْ" تھی' مگر ناقص افعال جب مجزوم ہوتے ہیں (جس کی ایک شکل فعل امر ہوتا ہے) تو لام کلمہ کے طور پر آنے والا حرفِ علت (و یا ی) کتابت اور تلفظ سے گر جاتا ہے۔ یوں یہ لفظ اب بوزن "فَاعِ" رہ گیا ہے۔

● اِس مادہ سے فعل مجرد "رعَی یَرعَی (رَعَی یَرْعَی) رَعْیاً و مَرْعًی" (فتح سے) کے بنیادی معنی ہیں "جانور کی حفاظت کرنا خوراک مہیا کر کے یا دشمن سے بچا کر۔" پھر اِس میں "مویشیوں کا (گھاس وغیرہ کو) چرنا (چر جانا) یا ان کو (اس میں) چرانا (چرنے کے لئے چھوڑنا)" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی یہ فعل تو متعدی ہی ہے اور اِس کا مفعول "گھاس یا چراگاہ" بھی ہو سکتا ہے اور "مویشی وغیرہ" بھی۔ مثلاً کہیں گے : "رَعَتِ الْمَاشِیَۃُ الْکَلَأَ" (مویشیوں (الماشیۃ) نے گھاس (الکلأ) کو چر لیا۔ چر گئے) اور "رَعَی الماشیۃَ" (اس نے مویشیوں کو چرانے کے لئے کھلا چھوڑ دیا یعنی چرایا) ---- اور اگر "رَاعَی علٰی فلانٍ" کہیں تو اِس کا مطلب ہوتا ہے "اس نے فلاں کے مویشی چرائے۔" پھر اسی سے یہ فعل "نگرانی کرنا' حفاظت

کرنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً کہتے ہیں "رَعَی الشَّیْءَ" (اس نے چیز کی حفاظت کی) مگر اس صورت میں اِس کا مصدر زیادہ تر "رِعَایَۃً" آتا ہے (اسی سے ہمارا اُردو کا لفظ "رعایت" بنا ہے) اور اسی (حفاظت کرنا والے) معنی سے لفظ "رَعِیَّۃ" ماخوذ ہے جو اُردو میں تائے مبسوطہ کی املاء کے ساتھ (رعیّت) استعمال ہوتا ہے۔ یعنی زیرِ نگرانی یا زیرِ حفاظت افراد کا مجموعہ۔

● قرآنِ کریم میں اِس فعل مجرد (رَعَی یَرْعَی) سے صرف دو صیغۂ فعل دو ہی جگہ آئے ہیں۔ ان میں ایک جگہ (الحدید :۲۷) تو یہ "حفاظت کرنا" کے معنی میں ہے اور دوسری جگہ (طٰہٰ :۵۴) یہ "چرانا" کے معنی میں ہی آیا ہے۔ مزید فیہ کے بابِ مفاعلہ سے صرف یہی ایک صیغہ ("رَاعِ" نَا) دو جگہ آیا ہے۔ اِس پر ہم ابھی مزید بات کریں گے---- اِس کے علاوہ اِس کے فعل مجرد سے بعض مشتقات اور مصادر (راعون، الرعاء، رعایۃ اور مَرعَی وغیرہ) بھی پانچ چھ جگہ آئے ہیں۔

● زیرِ مطالعہ لفظ (راعِنا) کا پہلا حصہ "راعِ" (جیسا کہ اُوپر بیان ہوا) اِس مادہ (رعی) سے بابِ مفاعلہ کا صیغہ امر ہے۔ اِس باب سے فعل "راعَی..... یُراعِی رِعاءً و مُراعاۃً" کے معنی ہوتے ہیں: "..... کو ملاحظہ کرنا..... کا لحاظ کرنا..... کی طرف (ازراہِ کرم) متوجہ ہونا، التفات کرنا" بعض دفعہ اِس پر "الیٰ" کا صلہ بھی لگتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: "راعَی الرجلَ وراعَی الی الرجلِ" (اس نے آدمی کی طرف توجہ کی)۔ قرآنِ کریم میں یہ فعل بغیر صلہ کے ہی آیا ہے اور یوں "راعِنا" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "ہماری طرف توجہ یا التفات فرمایئے"۔ (صیغہ فعل تو واحد مذکر مخاطب ہے یعنی "تُو التفات کر، توجہ دے" کے معنی میں، مگر چونکہ اِس میں خطاب آنحضور ﷺ کو ہوتا تھا اِس لئے صیغہ تعظیم کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے)---- یوں اِس عبارت کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "ایمان والو! تم مت کہو: ہم پر توجہ فرما"---- تاہم اِس کا ترجمہ کیا گیا ہے "ایمان والو! تم (آنحضرت ﷺ کو متوجہ کرنے کے لئے) "راعِنا" کا استعمال مت کرو"---- اِس کی وجہ؟

● کتب تفسیر میں منقول ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اکثر نبی کریم ﷺ کو ان لفظوں (یعنی اِس صیغہ فعل) سے مخاطب کرتے تھے۔ یہودی آپؐ کو ان ہی الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے یا تو زبان مروڑ کر "رَاعِینَا" کہتے تھے جس کا مطلب بنتا ہے "ہمارے چرواہے"---- یا عربی زبان ہی کے ایک اور فعل "رَعَنَ یَرْعَنُ" (بمعنی احمق ہونا) سے اسم فاعل کا صیغہ حال "راعِنًا" دبی زبان میں کہہ دیتے۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ وہ اِس لفظ "راعِنَا" سے ملتا جلتا عبرانی زبان

کا کوئی لفظ بولتے تھے جس کے معنی "تجھے کچھ سنائی نہ دے" بنتے تھے۔ ایک دفعہ مشہور صحابی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کسی یہودی کی اس خباثت کو (اس لفظ کے استعمال میں) تاڑ لیا اور اسے آئندہ اِس سے باز رہنے کی دھمکی دی تو اِس نے کہا "تم بھی تو رسول اللہ (ﷺ) کو اسی لفظ سے مخاطب کرتے ہو۔" اِس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو اِس لفظ (رَاعِنَا) کے استعمال سے ہی روک دیا گیا۔ اب اگر کوئی یہ لفظ (اچھے مفہوم میں بھی) استعمال کرتا تو وہ گویا اپنے منافق یا یہودی ہونے کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتا۔ قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو اسی مفہوم کا ایک اور لفظ "اُنْظُرْنَا" (جس پر ابھی آگے بات ہوگی) استعمال کرنے کا حکم دیا---

● تو یہ ہے وجہ اِس عبارت کا مندرجہ بالا ترجمہ (مسلمانو "راعِنا" کہا ہی نہ کرو۔ یہ لفظ ہی استعمال نہ کرو) کرنے کی۔ یہودیوں کی اِس شرارت اور ناشائستگی کا مزید وضاحت کے ساتھ ذکر سورۃ النساء :۴۶ میں آیا ہے اور اِس حکم کی غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کو آنحضور ﷺ کے بارے میں بے ادبی کے ادنیٰ شائبہ (شک) سے بھی بچنا ضروری ہے اور اِس لحاظ سے یہ حکم محض وقتی یا عارضی نوعیت کا نہیں بلکہ دائمی نوعیت کا ہے۔ اور ضمناً اِس میں یہ سبق بھی ہے کہ کسی سے مخاطبت میں (چاہے وہ مخالف ہو یا دشمن ہی کیوں نہ ہو) شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ جس کے نمونے ہمارے سیاست دانوں کی "زبان" میں اکثر ملتے ہیں۔

● اُردو کے تو قریباً سب ہی مترجمین نے "رَاعِنَا" نہ کہو' یا اسی سے ملتا جلتا ترجمہ کیا ہے البتہ انگریزی اور فارسی کے بعض مترجمین نے "رَاعِنَا" کا (اور آگے آنے والے لفظ "انظرنا" کا) لفظی ترجمہ بھی کر دیا ہے [مثلاً "رَاعِنا" = مارا رعایت کن اور "اُنْظُرنا" = مارا در نظردار) یا "راعِنا" (Listen to us) اور "اُنْظُرْنَا" (Have patience with us) کی صورت میں] مگر اِس کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ بلحاظ معنیٰ تو "رَاعِنَا" اور "اُنْظُرْنَا" قریباً مترادف ہی تھے۔ بعض (مثلاً عبداللہ یوسف علی) نے ان کلمات کا نہ تو ترجمہ کیا ہے اور نہ اصلی لفظ رہنے دیئے ہیں بلکہ "مبہم اور غیر واضح الفاظ میں مخاطب نہ کرو" ---- اور "واضح مؤدبانہ زبان استعمال کرو" کی صورت (انگریزی) میں ترجمہ کیا ہے جو ظاہر ہے تفسیری ترجمہ ہے۔

(۲) [....وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا] کی کلمہ وار وضاحت یوں کی ہے :

① "وَقُوْلُوْا" (اور تم کہو' کہا کرو)۔ لفظ "قُوْلُوا" (جس کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "اُفْعُلُوا" ہے' یعنی یہ قَالَ یَقُوْلُ (کہنا) سے فعل امر کا صیغہ ہے) اِس سے پہلے یہ لفظ اسی صیغہ کے ساتھ البقرہ :۵۸ [۲:۷:۳:۱(۴)] میں گزر چکا ہے۔

④ "اُنظُرْنَا" (ہم کو دیکھئے، ہم پر بھی نظر (کرم کی) ڈالئے)۔ اِس میں بھی آخری "نَا" تو ضمیر منصوب (بمعنی "ہم کو") ہے اور "اُنظُرْ" بروزنِ اُنْصُرْ (اُفْعُلْ) صیغہ امر ہے۔ اِس کے فعل "نَظَرَ..... یَنْظُرُ نَظْراً" (..... کو دیکھنا، کو نظر میں رکھنا) کے باب اور معنی وغیرہ پر البقرہ :۵۰ [۲: ۳۲: ۱ (۱۴)] میں بات ہوئی تھی۔ یہ فعل متعدی ہے اور کسی صلہ کے بغیر اور مختلف صلات کے ساتھ مختلف معنی دیتا ہے۔ مثلاً "نَظَرَہٗ" کا مطلب (اس نے اسے (ذرا غور سے) دیکھا) (یا اِس کا منتظر رہا) بھی ہیں اور اسی (نَظَرَہٗ) کے معنی "اس کی حفاظت اور نگرانی کی" بھی ہیں اور "اس کو مہلت یا فرصت دی" کے بھی۔ اور "نَظَرَ فِیہِ" کا مطلب ہے "اس نے اِس میں غور و تدبر کیا" اور "نَظَرَ اِلَیْہِ" کے معنی "اِس کی طرف نظر دوڑائی۔ اسے دیکھا" ہیں۔

● قرآنِ کریم میں اِس فعل سے بکثرت صیغہ ہائے فعل استعمال ہوئے ہیں اور قرآن میں یہ فعل کسی صلہ کے بغیر (مفعول بنفسہٖ کے ساتھ یا اِس کے حذف کے ساتھ) بھی آیا ہے اور "فِی" اور "اِلٰی" کے صلہ کے ساتھ بھی مندرجہ بالا تمام معانی کے لئے (مختلف جگہ) استعمال ہوا ہے۔

● یہاں زیرِ مطالعہ لفظ "اُنظُرنَا" کا لفظی ترجمہ تو "ہم کو دیکھئے، ہم پر نظر کیجئے، ہمیں فرصت دیجئے" ہی بنتا ہے (یعنی بصیغہ تعظیم)۔ اِس سے ظاہر ہے کہ بلحاظ معنی تو "رَاعِنا" کا مترادف ہی ہے مگر اُس لفظ (رَاعِنَا) کے ادا کرنے میں اندر کی خباثت کا "دبا دبا" اظہار ممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُس لفظ کے استعمال سے ہی روک دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نے اُردو میں اِس ساری عبارت (لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا) کا (جو اُوپر نمبر ۱ و نمبر ۲ میں زیرِ بحث آئی ہے) کا ترجمہ "تم مت کہو "رَاعِنَا" اور (اس کی بجائے) تم "اُنظُرْنَا" کہا کرو" کی صورت میں کیا ہے۔

③ "وَاسْمَعُوا" (اور تم سنو، سن لو)۔ یہ فعل "سَمِعَ یَسْمَعُ" (سننا) سے صیغہ امر ہے۔ اِس عام مستعمل فعل مجرد پر بحث البقرہ :۷ [۲: ۶: ۱ (۳)] میں اور پھر البقرہ :۷۵ [۲: ۷۴: ۱ (۳)] میں گزر چکی ہے۔

● مندرجہ بالا دونوں عبارتوں (لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنا وَ قُوْلُوا انْظُرنا وَاسْمَعُوا) میں جو نہی اور امر کے صیغے ہیں ان میں سے پہلے دو (لَا تَقُوْلُوا اور قُوْلُوا) کا تعلق تو نبی کریم ﷺ سے ہے۔ یعنی ان کے بعد "لِلنَّبِیِّ" مقدر ہے (نبی ﷺ سے یوں مت کہو بلکہ یوں کہو)۔ آخری صیغہ امر (وَاسْمَعُوا) کا تعلق بظاہر اِس دیئے گئے حکم سے ہے۔ اسی لئے اِس کا ترجمہ "خوب سن رکھو، بغور سنو" کی صورت میں بھی کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اِس "سننے" کا تعلق بھی

آنحضور ﷺ کی بات سے ہو۔ اِس لئے بعض نے اِس کا ترجمہ "سنتے رہو' سنتے رہا کرو" سے بھی کیا ہے' کیونکہ فعل "اسمعوا" کے بعد اِس کا "مفعول" محذوف ہے جو مندرجہ بالا دو امکانات سے خالی نہیں ہے۔

(۳) [وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ] (اور کافروں کے لئے دردناک سزا ہوگی)

① "وَلِلْكٰفِرِيْنَ" جو "و" (اور) + "لِ" (کے لئے) + الکافرین (کافروں) کا مجموعہ ہے۔ "و" عاطفہ کئی جگہ گزری ہے۔ لام الجر (لِ) کے معانی اور موقع استعمال پر الفاتحہ :۲ [۱:۲:۱(۴)] میں بات ہوئی تھی۔ اور کلمہ "الکافرین" جو فعل مجرد کفَرَ یکفُر (کفر کرنا' انکار کرنا) سے اسم الفاعلین مجرور ہے۔ یہی لفظ البقرہ :۱۹ [۲:۱۲:۱(۱۴)] میں گزرا ہے اور فعل "کَفَرَ" پر البقرہ :۶ [۲:۵:۱(۱)] میں بات ہوئی تھی۔

② "عَذَابٌ" (سزا' مار' عذاب) ویسے تو اُردو میں عام متعارف لفظ ہے' تاہم اِس کی لغوی بحث کے لئے البقرہ :۷ [۲:۶:۱(۶)] دیکھ لیجئے۔

③ "اَلِيْمٌ" (دردناک' دکھ دینے والا' دُکھ بھرا) جو مادہ "ا ل م" سے "فَعِيْلٌ" کے وزن پر صفت مشبّہ ہے۔ مزید لغوی وضاحت کے لئے دیکھئے البقرہ :۱۰ [۲:۸:۱(۹)] مندرجہ بالا اکٹھی ترکیب (توصیفی) یعنی "عَذَابٌ اَلِيْم" پہلی دفعہ البقرہ :۱۰ [۲:۸:۱(۹)] میں گزری ہے۔

(۴) [مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ] اِس عبارت میں نیا لفظ صرف "اَھْل" ہے جس پر ذرا تفصیلی بات ہوگی۔ باقی کلمات بالواسطہ یا بلاواسطہ پہلے گزرے ہیں۔ ان کا صرف ترجمہ اور گزشتہ حوالہ لکھ دینا کافی ہوگا۔

① "مَا يَوَدُّ" (نہیں چاہتا' دل نہیں چاہتا' ذرا بھی پسند نہیں کرتا' وہ خوش نہیں) ابتدائی "مَا" نافیہ (بمعنی "نہیں") ہے (دیکھئے البقرہ :۳ [۲:۲:۱(۵)]) اور فعل "یَوَدُّ" جو "ودد" مادہ سے صیغہ مضارع بروزن "یَفْعَلُ" ہے' اِس فعل مجرد (وَدَّ یَوَدُّ" چاہنا) کے باب' معنی اور استعمال وغیرہ کی البقرہ :۹۶ [۲:۵۹:۱(۴)] میں کلمہ "یَوَدُّ" ہی کے ضمن میں وضاحت کی جا چکی ہے۔

② "الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (وہ لوگ جو کافر ہوئے) بعینہٖ یہی صلہ موصول سب سے پہلے البقرہ :۶ [۲:۵:۱(۱)] میں گزرا ہے۔ ضرورت ہو تو اُدھر رجوع کریں۔

③ "مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ" (کتاب والوں میں سے۔ اہل کتاب میں سے) کلمہ "مِنْ" (جو یہاں بیان یا تبعیض کے لئے ہے) کے لئے دیکھئے البقرہ :۳ [۲:۲:۱(۵)] اور لفظ "الکتاب" (کتاب جس سے یہاں مُراد آسمانی کتاب۔ توراۃ و انجیل ہے) کی لغوی بحث بھی البقرہ :۲ [۲:۱:۱(۲)]

میں گزری ہے۔ چاہیں تو دیکھ لیجئے۔ کلمہ "اَھْلٌ" (جو عبارت میں مجرور اور خفیف ہے) کا مادہ "اھ ل" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اِس سے فعل مجرد مختلف ابواب سے مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "اَھَلَ یَاْھَلُ اَھْلاً" (نصر سے) کے ایک معنی "..... سے شادی کر لینا" ہیں۔ کہتے ہیں "اَھَلَ فُلَانَۃً" (اس نے فلاں عورت سے شادی کر لی) اور یہی فعل بطور "لازم" شادی شدہ ہوگیا کے معنی بھی دیتا ہے اور "آباد ہونا" کے بھی۔ مثلاً کہتے ہیں: "اَھَلَ الْمَکَانُ" (اَھُولاً مصدر کے ساتھ) یعنی مکان آباد ہوگیا۔ (اس میں گھر والے آ بسے) اور فعل "اَھِلَ یَاْھَلُ اھلاً" (سمع سے) کے معنی "..... سے مانوس ہونا" بھی ہیں مگر اس صورت میں اِس پر "با" کا صلہ لگتا ہے۔ کہتے ہیں "اَھِلَ بہٖ" (وہ اس کے ساتھ مانوس ہوگیا)۔ اسی سے پالتو جانوروں (بخلاف جنگلی یعنی وحشی کے) کو بھی "اھلیٌّ" کہتے ہیں مثلاً "حِمار اھلیٌّ" (پالتو گھریلو گدھا)۔ اور بطورِ فعل مجہول بھی یہ فعل لازم والے معنی دیتا ہے مثلاً کہیں گے "اُھِلَ الْمَکَانُ" (مکان آباد ہوگیا' کر لیا گیا) آباد مکان کو "مَاْھُوْل" کہتے ہیں۔ اور "الارضُ الماْھولۃُ" "وہ زمین ہے جہاں آبادی (یعنی مکانات) بن جائیں"۔ مجرد کے علاوہ عربی زبان میں اِس مادہ سے مزید فیہ کے متعدد ابواب سے فعل مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآنِ کریم میں اِس سے کسی قسم کا کوئی صیغہ فعل (نہ مجرد نہ مزید فیہ) کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔

● زیر مطالعہ لفظ "اَھْل" فعل مجرد سے مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ اور یہ بھی متعدد معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اِس میں بنیادی مفہوم "نسب' دین' گھر' وطن' پیشہ' شہر وغیرہ کی وجہ سے اکٹھے ہونے والوں" کا ہے۔ اسی لئے اِس کا ترجمہ "گھر والے' بیوی' قریبی رشتہ دار' پیروکار' حقدار' مالک' لائق' مستحق' باشندے (رہنے والے)" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے اور قرآنِ کریم میں یہ تمام معانی مختلف مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ اِس لفظ کی جمع سالم آتی ہے یعنی "اَھْلُوْنَ" اور "اَھْلِیْنَ" (بصورتِ نصب یا جر) اور جمع مکسر "اَھَالِی" ہے جو قرآن میں نہیں آئی۔

● یہ لفظ بصورت واحد یا جمع ہر صورت میں مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے اور اِس کا مضاف الیہ کوئی اسم ظاہر بھی ہو سکتا ہے اور کوئی ضمیر بھی۔ اُردو میں عموماً "اھل....." کا ترجمہ "والے' والا" سے کیا جاتا ہے۔ اور اِس لحاظ سے خود لفظ "اھل" (واحد) میں بھی مجموعہ یا جمع کا مفہوم موجود ہوتا ہے اور جمع سالم زیادہ تر "گھر والوں یا قریبی رشتہ داروں" کے معنی میں ہی آتی ہے ورنہ زیادہ تر واحد' جمع' مذکر' مؤنث سب کے لئے لفظ "اَھْل" ہی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہیں گے "ھُوَ / ھِیَ / ھُمْ / ھُنَّ اَھْلٌ کَذَا یا اَھْلٌ لِکَذا" "اُس چیز کے اہل' مستحق' حقدار ہیں۔)

● عربی میں خوش آمدید (Welcome) کے لئے یہی لفظ "اَھْلاً" (منصوب) استعمال ہوتا ہے "اَھْلاً وَسَھلاً" کا اصل مطلب ہے "جِئتَ اھلاً وَ نَزلتَ مکانًا سھلاً" (تو گھر والوں کے پاس آیا اور میدانی جگہ میں اُترا" (سَھْل کے معنی ہیں میدانی علاقہ بخلاف ریتلے یا پہاڑی کے) یعنی "یہاں تیری سواری کے جانور کے لئے بھی چارہ گھاس بآسانی مل جائے گا۔"

● لفظ "اھل" قرآنِ کریم میں کسی اسم ظاہر کی طرف مضاف ہو کر ۵۴ جگہ اور ضمائر کی طرف مضاف ہو کر ۶ جگہ آیا ہے اور بصورت جمع سالم مضاف ہو کر بھی کل چھ مقامات پر آیا ہے۔ زیر مطالعہ جگہ میں یہ "الکتٰب" کی طرف مضاف ہو کر آیا ہے یعنی "کتاب والے" اور اِس سے مُراد عموماً یہودی یا عیسائی لئے جاتے ہیں۔

"وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ" (اور نہ ہی مشرکوں میں سے (کوئی)۔ "واو" عاطفہ (اور) اور "لا" نافیہ (نہیں) کے بعد لفظ "الْمُشْرِكِيْنَ" مادہ "ش ر ك" سے بابِ اِفعال کا صیغہ اسم الفاعلین بروزن (لا م تعریف کے بغیر) "مُفْعِلِيْنَ" ہے۔ اِس باب کے فعل "اَشْرَكَ..... يُشْرِكُ" (شریک بنانا' شرک کرنا) کے معنی و طریق استعمال پر البقرہ :۹۶ [۲:۵۹:۱(۳)] میں بات ہوئی تھی۔

● زیر مطالعہ لفظ "المشرکین" کے لفظی معنی تو ہیں "شرک کرنے والے' (خدا کے ساتھ کسی کو) حصّہ دار ٹھہرانے والے"۔ اور یہ کوئی بھی ہو سکتے ہیں۔ تاہم چونکہ زمانہ قبل از اسلام میں اہل عرب کا عام مذہب بت پرستی اور شرک ہی تھا اِس لئے قرآنِ کریم میں ان کو "مشرك" (مشرکون۔ مشرکین) کہہ کر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے اُردو میں اِس کا لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے صرف "مشرکوں" یا "مشرکین" کے اردو استعمال سے ہی کیا گیا ہے اگرچہ بعض نے "شرک والوں" سے بھی ترجمہ کیا ہے۔

اِس ترکیب "ولا المشرکین" پر مزید بحث "الاعراب" میں آئے گی۔ اور زیر مطالعہ عبارت ایک نامکمل جملہ ہے جس کا ترجمہ تو بنتا ہے "اور نہیں چاہتے وہ لوگ جو کافر ہوئے کتاب والوں میں سے اور نہ ہی شرک والوں (میں سے)....." "ما یوَدُّ" کا ترجمہ "دل نہیں چاہتا' ذرا بھی پسند نہیں کرتے' خوش نہیں" سے کیا جا سکتا ہے۔ اِس میں "ذرا بھی" کا اضافہ اُردو محاورے کی بنا پر ہی کیا گیا ہے۔ پھر اُردو میں فاعل کے جمع "الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" ہونے کی وجہ سے "يَوَدُّ" کے بصیغہ جمع ترجمہ کرتے ہوئے ترجمے کے فعل کے مطابق "ان لوگوں کا جو کافر ہوئے" (دل نہیں چاہتا) یا کافر لوگ (پسند نہیں کرتے' خوش نہیں) کی صورت دی گئی ہے۔

"مِنْ اَھلِ الکتاب ولَا المشرکین" کا ترجمہ ڈبل منفی (مَا اور لَا) کے آنے کی بناء پر "اہلِ کتاب / کتابی / ہوں یا مشرک"۔ "خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکوں میں سے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ....." یہ جملہ مکمل ہوگا اگلی عبارت کے ساتھ جس میں بیان ہوا ہے کہ وہ کیا چیز پسند نہیں کر رہے؟ کس سے خوش نہیں؟

(۵) [.....اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ]

(کہ اُتارا جائے تم پر بھلائی میں سے (کچھ بھی) تمہارے رب کی طرف سے)

① "اَنْ" (یہ کہ، یہ بات کہ، کہ) دیکھئے البقرہ :۲۶ [۲:۱۹:۱(۲)] میں۔

② "یُنَزَّلَ" (اُتارا جائے، نازل کیا جائے)۔ یہ مادہ "ن ز ل" سے باب تفعیل کا صیغہ مضارع مجہول ہے۔ اِس فعل (نزَّل یُنَزِّل = اُتارنا) کے معنی و استعمال پر البقرہ :۲۳ [۲:۱۷:۱(۲)] میں بات ہوئی تھی۔

③ "عَلَیْکُمْ" (تمہارے اُوپر، تم پر) دیکھئے الفاتحہ :۷ [۱:۶:۱(۵)] میں "عَلَیْھِمْ"۔

④ "مِنْ خَیْرٍ" (بھلائی میں سے (کچھ)، کچھ بھلائی، کوئی بھی بھلائی)

"مِنْ" کے اِس استعمال (تنصیصِ نکرہ) کے لئے دیکھئے بحث استعاذہ اور دوبارہ البقرہ :۳ [۲:۲:۱(۵)] میں۔ کلمہ "خَیْر" کی لغوی بحث البقرہ :۵۴ [۲:۳۴:۱(۵)] میں گزری ہے۔ اِس زیرِ مطالعہ ترکیب "مِنْ خَیرٍ" پر مزید بحث "الاعراب" میں ہوگی۔

⑤ "مِنْ رَّبِّکُمْ" (تمہارے پروردگار کی جانب سے، طرف سے)۔

یہاں "مِنْ" ابتدائیہ ہے (دیکھئے [۲:۲:۱(۵)] میں "مِنْ" کی بحث)۔ کلمہ "رَبّ" (جو خود بھی اُردو میں مستعمل ہے) کی لغوی بحث کے لئے دیکھئے الفاتحہ :۱ [۱:۱:۲(۳)]

● چونکہ "اَنْ یُّنَزَّل" کے بعد (نائب فاعل "خَیر" ہے جو عربی میں مذکر ہے اِس لئے صیغۂ فعل مذکر آیا ہے مگر اُردو ترجمہ "بھلائی، نیک بات وغیرہ" مؤنث ہے اِس لئے "ینزَّل" کا اُردو ترجمہ بصیغہ مؤنث "اُتاری جائے، نازل کی جائے" سے کیا گیا ہے۔ بہت سے مترجمین نے "اَن ینزَّل" کا ترجمہ "کہ اُترے یا نازل ہو" سے کیا ہے جو بلحاظ مفہوم ہی درست ہے ورنہ بظاہر یہ "یُنزِل" (مجرد) کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض نے اِس کا ترجمہ "نصیب ہو (تم کو) سے کیا ہے جو اُردو محاورے کے لحاظ سے تو درست ہے مگر اصلی عبارت سے بہت ہٹ کر ہے---- اِس طرح یہ زیرِ مطالعہ حصہ عبارت اپنے سے سابقہ عبارت (یعنی نمبر۱ و نمبر۲ مندرجہ بالا) مل کر ایک پورا مربوط جملہ بنتا ہے۔ اسی لئے ان عبارتوں کے شروع اور آخر میں خالی نقطے (.....)

ڈالے گئے ہیں۔

(۶) [وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ] اِس عبارت میں تنہا لفظ صرف "يَخْتَصُّ" ہے جس پر مفصل بات ہوگی۔ باقی کلمات اِس سے پہلے گزر چکے ہیں' ان کا صرف ترجمہ اور گزشتہ حوالہ کافی ہوگا۔

① "وَاللّٰهُ" (اور اللہ تعالیٰ)۔ واوِ عاطفہ بار بار گزری ہے۔ اسم جلالت "اَللّٰه" کی لغوی بحث اگر دیکھنا چاہیں تو "بِسْمِ اللّٰه" کی بحث [۱:۱:۱(۲)] کی طرف رجوع کریں۔

② "يَخْتَصُّ" کا مادہ "خ ص ص" اور وزن اصلی "يَفْتَعِلُ" ہے۔ یعنی یہ دراصل "يَخْتَصِصُ" تھا۔ پھر پہلا "ص" ساکن کر کے دوسرے "ص" میں مدغم کر دیا جاتا ہے۔ اِس مادہ سے فعل مجرد دو مختلف ابواب سے مختلف مصادر کے ساتھ مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بطورِ فعل لازم متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور بصورتِ متعدی اِس کے مفعول کے ساتھ مختلف صلات مزید مختلف معنی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً "خَصَّ يَخُصُّ خُصُوصًا" (نصر سے) کے معنی ہیں "خاص ہونا" یعنی یہ "عام ہونا" کی ضد ہے مثلاً کہتے ہیں "خَصَّ الشَّيْءُ" (چیز خاص ہو گئی) اور ان معنی کے لحاظ سے یہ فعل لازم ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ (جیسا اُوپر معنی بیان کرنے سے ظاہر ہے) اُردو میں بہت زیادہ استعمال ہونے والے دو لفظ "خاص" اور "عام" خالص عربی الفاظ ہیں۔ "خاص" تو اسی فعل "خَصَّ يَخُصُّ" سے اسم الفاعل ہے' یعنی یہ دراصل "خَاصِصٌ" ہے اور عام بھی ایک دوسرے عربی فعل "عَمَّ يَعُمُّ عُمُومًا" (عام ہونا) سے اسم الفاعل ہے' یعنی وہ بھی دراصل "عَامٌّ" ہی ہے۔ تاہم اُردو میں یہ دونوں لفظ "ص" اور "م" کی تشدید کے بغیر مگر اپنے اصل عربی معنی میں مستعمل ہیں۔ حتیٰ کہ "خَصَّ" کا ترجمہ بھی "خاص ہونا" سے کرنا پڑتا ہے۔ ③ اِسی سے یہ فعل بطورِ متعدی "خاص کر لینا" کے معنی بھی دیتا ہے مثلاً کہتے ہیں "خَصَّ فُلَانًا بِالشَّيْءِ خُصُوصِيَّةً" (اس نے فلاں کو اِس چیز کے ساتھ خاص کر دیا) یعنی وہ چیز صرف اسی کو دی کسی دوسرے کو نہیں دی اور ④ "خصَّ الشَّيْءَ لِنفسه" (اس نے اِس چیز کو اپنے لئے خاص کر لیا یعنی اپنے لئے چن لی اور ⑤ "خَصَّ يَخُصُّ خَصاصًا و خَصاصَةً" (فتح سے) کے معنی ہیں "وہ غریب اور تنگ دست ہوگیا" (اور اسی کا مصدر "خَصَاصَة" قرآنِ کریم میں بھی استعمال ہوا ہے)۔ "خَصَاص" یا "خَصَاصَة" لکڑی سرکنڈے وغیرہ کے بنے مکان کی "درزوں" کو کہتے ہیں جو غربت کی علامت ہے۔ ویسے کسی "درز" یا "درمیانی خالی جگہ" کو بھی خصاص

کہتے ہیں مثلاً کہتے ہیں "بدَ القمرُ مِن خصاص الغَیم" (چاند بادلوں کی "درز" یا "درمیانی خالی جگہ" سے نمودار ہوا)۔
تاہم قرآنِ کریم میں اِس فعل مجرد سے کسی طرح کا کوئی صیغہ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اِس سے مشتق لفظ "خاصَّة" صرف ایک جگہ (الانفال : ۲۵) اور اِس کا ایک مصدر "خَصاصَة" بھی صرف ایک جگہ (الحشر :۹) ہی میں آیا ہے۔ جن پر مزید بات حسب موقع ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "یختصّ" اِس مادہ سے بابِ افتعال کا فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اِختَصَّ یَختَصّ اختصاصًا" بھی فعل مجرد کے بیان کردہ (مذکورہ بالا) چاروں معانی کے لئے ترتیب وار اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ① "اِختصَّ الشَّیئَ" (خاص ہونا) ② "اِختصَّ فلانًا بالشیئِ" (خاص کر لینا یعنی فلاں کو ہی دینا) ③ "اختصَّ الشیئَ لِنفسہٖ" (اپنے لئے خاص کر لینا) اور ④ "اختصَّ" (تنگ دست ہونا)۔ یعنی استعمال کے لحاظ سے دونوں فعل ایک جیسے ہیں۔ زیرِ مطالعہ عبارت میں یہ فعل مندرجہ بالا دوسرے (نمبر۲) معنی کے لئے آیا ہے یعنی "(کسی کو کسی چیز کے لئے) خاص کرتا ہے، مخصوص کرلیتا ہے' خاص کر دیتا ہے" کے معنی میں استعمال ہوا۔ کس کو؟ اور کس چیز کے لئے؟ اِس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اِس باب سے صرف یہی صیغہ فعل قرآنِ کریم میں دو جگہ آیا ہے' یہاں اور پھر آل عمران :۷۴ میں۔

③ "بِرَحمَتِہٖ" (اس کی / اپنی رحمت کے ساتھ / کے لئے)
یہاں باء "بِ" تو وہی ہے جس کے فعل "خَصَّ اور اختصَّ" کے مفعول کے بعد استعمال کی اُوپر بات ہوئی ہے اور اِس کا ترجمہ یہاں "کے لئے" بھی کر سکتے ہیں اور باء سببیہ سمجھ کر "کے ساتھ ' سے" کی صورت میں بھی کیا گیا ہے۔ کلمہ "رحمة" (جو اُردو میں "رحمت" کی املاء سے رائج ہے) کی لغوی وضاحت البقرہ :۶۴ [۲:۴۱:۱(۵)] کے بعد گزری ہے۔

④ "مَنْ یَشَاءُ" (جس کو چاہتا ہے وہ)۔ اِس میں "مَنْ" اسم موصول (بمعنی "وہ جو کہ") یہاں دراصل فعل "یَختَصُّ" کا مفعول ہے اور فعل "یَشَاءُ" (وہ چاہتا ہے) جو "ش ی ء" مادہ سے بروزن "یَفعَلُ" فعل مضارع ہے' اِس کے باب اور معنی وغیرہ "شَاءَ یَشَاءُ" پر البقرہ :۲۰ [۲:۱۵:۱(۸)] میں کلمہ "شَاءَ" کے ضمن میں بات ہوئی تھی۔

● پس اِس عبارت کا ترجمہ بنتا ہے "اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے" جس کی سلیس اُردو مفعول کو پہلے لانے سے "جس کو چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر

لے" کی صورت بھی دی گئی ہے۔ اور بعض نے اُردو محاورے کے لئے "بِرَحْمَتِہٖ" کا ترجمہ فعل سے بھی پہلے کیا ہے' یعنی "اللہ اپنی رحمت سے جسے چاہے مخصوص کر لے" کی صورت میں--- ویسے بھی اُردو میں جملہ فعلیہ میں فعل آخر پر لایا جاتا ہے جب کہ عربی میں وہ شروع میں لگتا ہے۔ اِس عبارت پر مزید بحث "الاعراب" میں بھی دیکھ لیجئے۔

(۷) [وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ] (اور اللہ بڑے فضل والا ہے)

① "وَاللّٰہُ" (اور اللہ تعالیٰ) "وَ" یہاں عطف اور استیناف دونوں کی ہو سکتی ہے۔ اُردو ترجمہ بہرحال "اور" سے کیا جاتا ہے۔ اسم جلالت (اللّٰہ) "بِسْمِ اللّٰہِ" کی بحث میں دیکھئے۔

② "ذُوْ" (والا)۔ جس کی "ذ" پڑھنے میں "الفضل" کے پہلے لام "ل" سے ملا دی جاتی ہے اور اِس کی علامت رفع "و" اور "الفضل" کا ابتدائی ہمزۃ الوصل (ا) تلفظ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ اِس اسم "ذُو" کے استعمال پر اور اِس کی مذکر مؤنث واحد تثنیہ جمع رفع نصب جر کی مختلف صورتوں (ذُو' ذَا' ذِی وغیرہ) پر مفصل بحث البقرہ :۸۳ [۲:۵۱:۱(۲)] میں کلمہ "ذِی" کے سلسلے میں کی جا چکی ہے۔

③ "الْفَضْلِ" (فضل' مہر)۔ اِس لفظ کی لغوی بحث کے لئے دیکھئے البقرہ :۶۴ [۲:۴۱:۱(۵)] جہاں یہ لفظ پہلی دفعہ آیا تھا۔ اور اِس کے مادہ اور فعل مجرد وغیرہ کی بات البقرہ :۴۷ [۲:۳۱:۱(۱)] میں ہوئی تھی۔

④ "الْعَظِیْمِ" (بہت بڑا)۔ اِس لفظ کے مادہ' باب فعل وغیرہ اور خود اسی لفظ کی بناوٹ پر البقرہ :۷ [۲:۶:۱(۷)] میں بات ہوئی تھی۔

● اِس عبارت کا ترجمہ اُوپر ساتھ ہی لکھ دیا گیا ہے۔ بعض نے "والا" کی بجائے "بڑے فضل کا مالک" اور "بڑا فضل رکھتا ہے" سے ترجمہ کیا ہے جو بلحاظ مفہوم درست ہے۔ اور بعض نے "اللہ کا فضل بہت بڑا ہے" سے ترجمہ کیا ہے جو عربی عبارت کی ساخت اور ترکیب سے بہت ہٹ کر ہے۔ یہ تو "فَضْلُ اللّٰہِ عَظِیْمٌ" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

۲ : ۶۳ : ۲ اَلْاِعراب

زیر مطالعہ قطعہ یوں تو متعدد چھوٹے بڑے (نحوی) جملوں پر مشتمل ہے جن میں سے بعض واوِ عاطفہ کے ذریعے مل کر ایک جملہ بن جاتے ہیں۔ اِس لئے ترکیب نحوی کے لئے اِس عبارت کو دراصل پانچ جملوں میں ہی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پانچ جملوں میں سے ہر ایک کے آخر پر کم از کم وقف مطلق کی علامت (ط) لگتی ہے۔ یا پھر اِس کے ساتھ آیت

مکمل ہوتی ہے جو خود علامتِ وقف ہے۔ تفصیل یوں ہے :

① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا

[یایھا] حرفِ ندا یا ایک اندازِ ندا ہے جس میں بیک وقت دو حرفِ ندا "یا" اور "ایھا" استعمال ہوئے ہیں (نحوی حضرات "ایھا" کے "ایُّ" کو منادیٰ نکرہ مقصودہ (بمعنی "وہ کہ") اور "ھَا" کو حرفِ تنبیہہ (متوجہ کرنے کی آواز) کہتے ہیں) [الذین] منادیٰ اسم موصول ہے (نحوی حضرات اسے "ایھا" کا بدل کہتے ہیں کیونکہ وہ اسے ہی اصل "منادیٰ نکرہ مقصودہ" کہتے ہیں) "الذین" کو یہاں منادیٰ مفرد سمجھ کر مرفوع محلاً قرار دیا جا سکتا ہے۔ [آمَنُوْا] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین (ھُمْ) جملہ فعلیہ بن کر اسم موصول (الذین) کا صلہ ہے اور دراصل تو پورا صلہ موصول منادیٰ ہے۔ [لَاتَقُوْلُوْا] کی ابتدائی "لا" لائے نھی (ناھیہ) ہے اور "تَقُوْلُوْا" فعل مضارع مجزوم (بلائے نہی) ہے۔ یعنی "لَا تَقُوْلُوْا" فعل نھی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ [رَاعِنَا] اصل کے لحاظ سے تو یہ صیغہ فعل امر (رَاعِ) مع مفعول بہ (نَا) پورا جملہ ہے مگر یہاں یہ بطورِ حکایت آیا ہے اور اِس کے معنی نہیں بلکہ خود لفظ "رَاعِنَا" مُراد ہے یعنی "مت کہو رَاعِنَا" ۔ اِس طرح خود یہ جملہ "رَاعِنا" یہاں "لَاتَقُوْلُوا" کا مفعول (مقول) ہو کر محلِ نصب میں ہے۔ [وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے [قُوْلُوْا] جو صیغہ امر جمع مخاطب مذکر ہے' "لَاتَقُوْلُوْا" پر عطف ہے۔ [اُنْظُرْنَا] بھی دراصل صیغہ فعل امر (اُنظر) مع اپنے مفعول بہ (نَا) کے جملہ فعلیہ ہے اور یہ جملہ "قُوْلُوْا" کا مفعول بہ (مقول) ہو کر محلاً منصوب ہے۔ [وَاسْمَعُوْا] واو عاطفہ ہے جس سے اگلا فعل "اِسْمَعُوْا" (جو فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے) سابقہ فعل "قُوْلُوْا" پر عطف ہے۔ یعنی ".... کہو اور سنو"۔ اور یہاں اِس فعل "اِسْمَعُوْا" کا مفعول بہ محذوف ہے (یعنی یہ بات سن لو یا رسول (ﷺ) کی بات پر کان دھرو وغیرہ)

② وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

[وَ] یہاں مستانفہ ہے' ایک الگ مضمون اور جملہ شروع ہوتا ہے [لِلکافِرین] لام الجر (لِ) اور مجرور (الکافرین) مل کر خبر مقدم کا کام دے رہے ہیں۔ [عَذابٌ] مبتدا نکرہ مؤخر ہے لہٰذا مرفوع بذریعہ تنوین رفع (ـٌ) ہے اور یہ موصوف بھی ہے کیونکہ آگے اِس کی صفت [الیم] ہے جو نکرہ اور مرفوع (اپنے موصوف کی طرح) ہے اور دراصل تو یہ مرکب توصیفی (عَذابٌ الیمٌ) مبتدا مؤخر ہے۔

③ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

مِّنْ رَّبِّكُمْ

[مَا] نافیہ ہے اور [يَوَدُّ] فعل مضارع معروف صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ [الَّذِينَ] اسم موصول فعل "يَوَدُّ" کا فاعل (لہٰذا) محلاً مرفوع ہے۔ مبنی ہونے کے باعث اِس میں ظاہراً کوئی علامتِ رفع نہیں ہے [كَفَرُوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین (هُمْ) جملہ فعلیہ بن کر صلہ (الذین کا) ہے اور دراصل صلہ موصول مل کر (الَّذِينَ كَفَرُوا) فعل "يَوَدُّ" کا فاعل ہیں۔ [مِنْ] حرف الجر یہاں تبعیض (کا ایک حصّہ کے معنی میں) یا بیان (وضاحت کے طور پر "از قسم" کے معنی میں) کے لئے ہے [اهلِ الكتابِ] مضاف (اهل) اور مضاف الیہ (الکتاب) مل کر (مِن کی وجہ سے) مجرور بالجر ہیں۔ "اهل" مجرور بھی ہے اور مضاف ہو کر خفیف بھی ہے اور "الکتاب" مجرور بالاضافہ ہے اور بلحاظ معنی یہ (مِن اهلِ الكتابِ) مرکب جاری "الذین کفروا" کا حال بھی سمجھا جا سکتا ہے (یعنی اہل کتاب میں سے ہوتے ہوئے کافر)۔ [وَلَا الْمُشْرِكِينَ] یہاں "المشرکین" بذریعہ "وَ" "اهلِ الكتاب" پر عطف ہے۔ اسی لئے یہ بھی مجرور بالجر "مِنْ" ہے۔ اور "لا" یہاں تاکید کے لئے آیا ہے۔ کیونکہ اگر یہاں صرف "والمشرکین" ہی ہوتا تو نحوی اعتبار سے ٹھیک ہی ہوتا۔ "لا" کے آنے سے اب اِس کا ترجمہ "اور نہ ہی مشرکوں میں سے" ہوگا۔ اسی کو مترجمین نے "کافر اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکوں میں سے" (کوئی بھی نہیں چاہتا۔ سب ہی ناپسند کرتے ہیں) کی صورت دی ہے۔ [أَن] حرفِ ناصب مضارع (بمعنی "کہ") ہے' جو اگلے فعل کے ساتھ مل کر اِس فعل میں مصدری معنی بھی پیدا کرتا ہے' جو یہاں بھی ممکن ہے۔ [يُنَزَّلَ] فعل مضارع مجہول منصوب "بِأَن" ہے۔ علامتِ نصب "لَ" کی فتحہ (ـَـ) ہے۔ [عَلَيْكُم] جار مجرور (علیٰ + کُم) مل کر متعلق فعل "ینزّل" ہیں اور یہ جملہ (ان ینزل علیکم) فعل "مايَوَدُّ" کا مفعول بہ لہٰذا محلاً منصوب ہے۔ یا اگر "أَن" کو مصدریہ سمجھ لیں تو بتاویل مصدریہ عبارت "تنزیلَ" کے طور پر (کا نازل ہونا) بھی اِس فعل کا مفعول بنے گا۔ (یعنی مصدر مؤول "تنزیل" منصوب سمجھا جائے گا)۔ [مِنْ] حرف الجر یہاں تنصیصِ (قطعیتِ) نکرہ کے لئے ہے جسے بعض نحوی زائدہ بھی کہہ دیتے ہیں۔ [خَيْرٍ] مجرور بالجر ہے۔ یہ دراصل "خیرٌ" (بطورِ نائب فاعل برائے فعل مجہول "ینزّل") مرفوع ہوتا جس کا ترجمہ "کچھ بھلائی" ہوتا۔ اب "مِنْ" کی وجہ سے اِس کی تنکیر میں مزید قطعیت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے اُردو ترجمہ (مِنْ خَیر کا) "کچھ بھی بھلائی" "بھلائی میں سے کچھ بھی" ہوگا۔ ترکیب نحوی کے لحاظ سے اب یہ (مِنْ خَیر) بطورِ نائب الفاعل محلاً مرفوع ہے۔ [مِنْ] یہاں "مِنْ" ابتدائیہ بمعنی "کی طرف سے" ہے اور [رَّبِّكُم] مرکب

اضافی (رَبِّ + کُم) مجرور بالجر ہے "رَبّ" مجرور بالجر اور بوجہ اضافت خفیف ہے اور یہ پورا مرکب جاری (من ربکم) "خَیر" (جو نکرہ موصوفہ بھی ہے) کی صفت ہے یعنی "کچھ بھی ایسی بھلائی جو تمہارے رب کی طرف سے ہو۔" یوں اِس سارے جملے کے تین بڑے حصے یوں ہیں۔ فعل (مایودّ)' فاعل (الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین) اور مفعول (ان ینزل علیکم من خیر من ربکم)۔

۴ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

[وَ] بہتر ہے کہ استیناف کی سمجھی جائے۔ [اللّٰهُ] مبتدا لہٰذا مرفوع ہے۔ [یختصُّ] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعل (اور مابعد عبارت سمیت) اِس (الله) کی خبر ہے۔ [برحمتہٖ] یہ پورا مرکب جاری (جس میں باء الجر کے بعد "رحمة" مجرور بالجر اور مضاف (لہٰذا خفیف) ہے اور ضمیر مجرور "ہ" مضاف الیہ ہے) متعلق فعل "یختصُّ" ہے جو مفعول پر مقدم ہو کر آیا ہے۔ [مَنْ] اسم موصول فعل "یختصُّ" کا مفعول بہٖ لہٰذا محلاً منصوب ہے بلکہ دراصل یہاں (موصول) سے مفعول شروع ہوتا ہے۔ [یشاء] فعل مضارع مع ضمیر الفاعل جملہ فعلیہ بن کر "مَن" کا صلہ ہے اور یہ صلہ موصول مل کر "یختص" کا مفعول بہ ہیں۔ لہٰذا محلاً منصوب ہیں۔ یہاں "یشاء" کے بعد اسم موصول "مَنْ" کے لئے ایک ضمیر عائد محذوف ہے یعنی یہ دراصل "یَشَاءُہٗ" (وہ چاہتا ہے اِس کو/جس کو) تھا۔ اور اِس جملے کی سادہ نثر یوں بنتی ہے "یختصُّ مَن یشاء برحمتہٖ" مگر متعلق فعل (برحمتہٖ) کو مفعول (مَن یَشاء) پر مقدم کرنے سے عبارت میں ادبی (شاعری کی سی) خوبی بھی پیدا ہوتی ہے اور "برحمتہٖ" میں ایک زور بھی پیدا ہوتا ہے جسے "رحمت ہی سے' رحمت ہی کے لئے" سے بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

۵ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

[وَ] عاطفہ یا مستانفہ ہو سکتی ہے۔ [اللّٰهُ] مبتدا مرفوع ہے اور [ذوالفضل] مضاف (ذُوْ۔ جو ہمیشہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے) اور مضاف الیہ (الفضل) مل کر خبر مرفوع ہے۔ علامت رفع "ذُوْ" کی "و" ہے (جو نصب میں الف (ذَا) اور جر میں "ی" (ذِی) ہو جاتی ہے)۔ [العظیم] الفضل (مجرور بالاضافہ) کی صفت ہے اسی لئے معرفہ اور مجرور ہے۔ یعنی "ذُوْ" کا پورا مضاف الیہ یہ مرکب توصیفی "الفضل العظیم" ہے۔

۴ : ۶۳ : ۳ الرسم

بلحاظ رسم اِس قطعہ میں قابل توجہ صرف چار لفظ ہیں۔ ان میں سے بھی ایک کا رسم مختلف فیہ ہے' باقی تین کا متفق علیہ ہے۔ ویسے یہ تینوں کلمات پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ یہ چار

لفظ "یایھا' راعنا' للکفرین اور الکتب" ہیں۔ تفصیل یوں ہے :

① "یایھا" جس کا قیاسی املاء "یاایھا" ہونا چاہئے۔ قرآنِ کریم میں اِس کے حرف ندا "یا" کا الف کتابت میں حذف کر دیا جاتا ہے (بصورت "یایھا") بلکہ قرآنِ کریم میں حرف ندا "یٰا" ہر جگہ بحذفِ الف ہی لکھا جاتا ہے اور یہ متفق علیہ رسم ہے۔ نیز دیکھئے البقرہ :۲۱ [۲:۱۹: ۳] میں "یایھا الناس" کا رسم۔

② "راعِنا" کے رسم میں اختلاف ہے' ابوداؤد کی طرف منسوب قول کے مطابق یہ بحذف الالف بعد الراء لکھا جاتا ہے' چنانچہ بیشتر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں یہ اسی حذف کے ساتھ بصورتِ "رعنا" لکھا جاتا ہے۔ پھر بذریعہ ضبط اِس الف کو ظاہر کرتے ہیں---- الدانی نے اِس کے حذف الف کی تصریح نہیں کی جو اثبات کو مستلزم ہے' چنانچہ لیبیا اور تمام مشرقی ممالک (ایران' ترکی' برصغیر) میں اسے باثباتِ الف بصورت "راعِنا" لکھا جاتا ہے۔

③ "للکفرین" جس کا عام رسم املائی "للکافرین" ہے' قرآنِ کریم میں یہاں اور ہر جگہ "الکفرین" (اور الکفرون بھی) بحذف الالف بعد الکاف لکھا جاتا ہے--- بلکہ رسم قرآنی میں عموماً تمام جمع مذکر سالم بحذفِ الف ہی لکھے جاتے ہیں۔ مستثنیات کا ذکر اپنی اپنی جگہ آئے گا۔ دیکھئے البقرہ :۱۹ [۲: ۱۴: ۳]

④ "الکتب" جس کا رسم املائی "الکتاب" ہے' قرآنِ کریم میں چار خاص مواقع کے سوا یہ یہاں اور ہر جگہ بالاتفاق بحذف الالف بعد التاء لکھا جاتا ہے۔ دیکھئے البقرہ :۲ [۲:۱: ۳]

۲ : ٦٣ : ۴ الضبط

يَٰٓأَيُّهَا' يٰٓاَيُّهَا/ الَّذِيْنَ' الَّذِينَ' ٱلَّذِينَ' ٱلَّذِيۡنَ/ اٰمَنُوْا' ءَامَنُوا' ءَامَنُواْ/ لَاتَقُوْلُوْا' لَاتَقُوْلُوْا' لَاتَقُولُواْ/ رَاعِنَا' رَٰعِنَا (بحذف الف)/ وَقُوْلُوْا' قُولُواْ/ انْظُرْنَا' انْظُرْنَا' ٱنظُرۡنَا/ وَاسْمَعُوْا' اسْمَعُوْا' ٱسۡمَعُواْ/ وَلِلْكٰفِرِيْنَ' لِلْكٰفِرِيْنَ' لِلْكَٰفِرِينَ' لِلۡكَٰفِرِينَ/ عَذَابٌ' اَلِيْمٌ' أَلِيمٌ/ مَايَوَدُّ/ الَّذِيْنَ (مثل سابق) كَفَرُوْا' كَفَرُوا' كَفَرُواْ/ مِنْ' مِنۡ/ اَهْلِ' أَهْلِ/ الْكِتٰبِ' ٱلۡكِتَٰبِ/ وَلَا' لَا' لَآ/ الْمُشْرِكِيْنَ' الْمُشْرِكِينَ' الْمُشْرِكِينَ' ٱلۡمُشۡرِكِينَ/ اَنْ' أَن' أَن/ يُّنَزَّلَ' يُنَزَّلَ/ عَلَيْكُمْ/ مِنْ (مثل اول)/ خَيْرٍ' خَيۡرٍ/ مِنْ' مِن' مِن/ رَّبِّكُمْ' رَّبِّكُمۡ/ وَاللّٰهُ' اللّٰهُ' ٱللَّهُ/ يَخْتَصُّ/ بِرَحْمَتِهٖ' بِرَحۡمَتِهِۦ/ مَنْ' مَن' مَن/ يَّشَآءُ' يَشَآءُ/ وَاللّٰهُ (مثل سابق) ذُو' ذُو/ الْفَضْلِ' ٱلۡفَضۡلِ/ الْعَظِيْمِ' الْعَظِيمِ' ٱلۡعَظِيمِ' ٱلۡعَظِيمِ۔

اشاریہ ماہنامہ "حکمت قرآن"

جنوری ۱۹۹۷ء تا دسمبر ۱۹۹۷ء (جلد ۱۶)

(مرتب : امتیاز احمد نگیال)

○

قرآنیات

احمد یار" پروفیسر حافظ

لغات و اعراب قرآن :

☆ قسط ۸۰ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۵۸) آیات ۹۴-۹۵	جنوری ۹۷ء ص ۴۷
☆ قسط ۸۱ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۵۹) آیت ۹۶	مارچ ۹۷ء ص ۸۳
☆ قسط ۸۲ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۶۰) آیات ۹۷-۹۸	اپریل ۹۷ء ص ۵۵
☆ قسط ۸۳ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۶۱) آیات ۹۹-۱۰۱	مئی ۹۷ء ص ۴۹
☆ قسط ۸۴ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۶۲) آیات ۱۰۲-۱۰۳	جولائی ۹۷ء ص ۴۵
☆ قسط ۸۵ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۶۲) گزشتہ سے پیوستہ	اگست ۹۷ء ص ۴۹
☆ قسط ۸۶ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۶۲) گزشتہ سے پیوستہ	ستمبر ۹۷ء ص ۵۳
☆ قسط ۸۷ : سورۃ البقرۃ (۲ : ۶۳) آیات ۱۰۴-۱۰۵	دسمبر ۹۷ء ص ۴۵

اخلاق حسین قاسمی' مولانا

قرآن حکیم اور عبادت گاہوں کا تحفظ	مارچ ۹۷ء ص ۲۹

اسرار احمد' ڈاکٹر

سلسلہ تقاریر تعارف الکتاب

قد افلح (۱۸)	جنوری ۹۷ء ص ۳
وقال الذین (۱۹)	مارچ ۹۷ء ص ۳
امن خلق (۲۰)	اپریل ۹۷ء ص ۳
اتل ما اوحی (۲۱)	نومبر ۹۷ء ص ۳

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

درس ۳ : حکمت قرآن کی اساسات (سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع) — جنوری ۹۷ء ص ۷
درس ۴ : حٰمٓ عظیم (حٰمٓ السجدہ' آیات ۳۰ تا ۳۶) — مارچ ۹۷ء ص ۷
درس ۵ : قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساس کامل : سورۃ الفاتحہ — اپریل ۹۷ء ص ۷
درس ۶ : عقل' فطرت اور ایمان (سورۂ آل عمران' آیات ۱۹۰-۱۹۵) — مئی ۹۷ء ص ۳
درس ۷ : نور ایمان کے اجزاء ترکیبی (سورۃ النور' آیات ۳۵-۳۸) — جون ۹۷ء ص ۵
درس ۸-۱ : ایمان اور اس کے ثمرات (سورۃ التغابن' آیات ۱-۱۰) — جولائی ۹۷ء ص ۳
درس ۸-۲ : ایمان اور اس کے ثمرات (سورۃ التغابن' آیات ۱۱-۱۵) — اگست ۹۷ء ص ۳
درس ۸-۳ : ایمان اور اس کے ثمرات (سورۃ التغابن' آیات ۱۶-۱۸) — ستمبر ۹۷ء ص ۳
درس ۹-۱ : اثبات آخرت کیلئے قرآن کا استدلال (سورۃ القیامہ) — دسمبر ۹۷ء ص ۳

توقیر عالم فلاحی' ڈاکٹر

قرآن کی فکری و فنی عظمت — مارچ ۹۷ء ص ۵۷
جہاد کا قرآنی تصور (۱) — جون ۹۷ء ص ۳۸
جہاد کا قرآنی تصور (۲) — جولائی ۹۷ء ص ۲۷

سیرت و سوانح

ظہیر احمد عباسی

پیکر رحمت ﷺ کا غصہ — ستمبر ۹۷ء ص ۳۱

عبدالرشید عراقی

امام احمد بن شعیب نسائیؒ — مئی ۹۷ء ص ۳۷
امام ابن ماجہؒ — اگست ۹۷ء ص ۴۳
امام جمال الدین زیلعیؒ — دسمبر ۹۷ء ص ۴۱

فقہ و اجتہاد

عبدالغفار حسن' مولانا

خاندانی منصوبہ بندی — ستمبر ۹۷ء ص ۱۵

نور احمد شاہتاز

منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں (۱) — جنوری ۹۷ء ص ۳۶
منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں (۲) — مارچ ۹۷ء ص ۷۸
منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں (۳) — مئی ۹۷ء ص ۳۲
منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں (۴) — جون ۹۷ء ص ۴۷

منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں (۵) — اگست ۹۷ء ص ۳۳

اسلام اور عصر حاضر

باسط بلال کوشل

دور حاضر میں مذہب سے بیزاری — جولائی ۹۷ء ص ۳۷
اسلام کا مستقبل — اگست ۹۷ء ص ۱۶

ممتاز احمد اعوان

عصری مسائل کا حل' سیرت طیبہ کی روشنی میں (۱) — ستمبر ۹۷ء ص ۴۱
عصری مسائل کا حل' سیرت طیبہ کی روشنی میں (۲) — دسمبر ۹۷ء ص ۳۱

معاشیات اسلام

محمد اکرم خان

قیمتوں میں اضافہ' اشاریہ بندی اور ربا — جنوری ۹۷ء ص ۴۳

محمد طاسین' مولانا

"ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل" — اپریل ۹۷ء ص ۳۶

اقبالیات

علاؤالدین شمس صدیقی

حکیم الامت علامہ اقبال اور مسئلہ تقدیر — اگست ۹۷ء ص ۲۵

نعیم احمد خان

علامہ اقبال : ایک عظیم عارف قرآن — نومبر ۹۷ء ص ۹

یاد رفتگان

عبدالغفار حسن' مولانا

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نام تعزیتی خط — جولائی ۹۷ء ص ۵۷

محمد ابراہیم شیخ' حافظ

حافظ احمد یار مرحوم و مغفور' بحیثیت استاد — جولائی ۹۷ء ص ۶۳

محمد شریف حافظ

چل بسیں گے ایک دن ہم بھی..... — نومبر ۹۷ء ص ۲۴

نصرۃ النعیم' ڈاکٹر

حافظ احمد یار مرحوم ایک علم دوست' درویش صفت انسان — جولائی ۹۷ء ص ۵۸

متفرقات

احمد یار،ؒ پروفیسر حافظ
صلیبیوں اور صیہونیوں کی قرآن دشمنی — مارچ ۹۷ء ص ۳۷

محمد یونس جنجوعہ، پروفیسر
اسلام اور شخصیت پرستی — دسمبر ۹۷ء ص ۲۵

تحریک رجوع الی القرآن . . . . پیش رفت

سہ ماہی رپورٹ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور — جنوری ۹۷ء ص ۶۰

انوار الحق چوہدری
سالانہ رپورٹ : شعبہ خط و کتابت کورسز — مارچ ۹۷ء ص ۱۰۴

انور علی بخاری
محاضرات قرآنی (تاثرات و مشاہدات) — جون ۹۷ء ص ۵۳

عارف رشید، ڈاکٹر
۲۵ سالہ رپورٹ (مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور) — نومبر ۹۷ء ص ۲۷

محمد طاہر خان خاکوانی، ڈاکٹر
قرآن اکیڈمی ملتان کے شب و روز — جون ۹۷ء ص ۶۳

تعارف و تبصرہ کتب

محمد یونس جنجوعہ
خطبات ختم نبوت — اپریل ۹۷ء ص ۵۲
ملک لوٹنے والے چہرے — مئی ۹۷ء ص ۴۷

حرف اول

ادارتی صفحات پر ہر ماہ "حرف اول" کے عنوان سے حافظ عاکف سعید صاحب کی تحریر شامل اشاعت ہوتی ہے۔

مضمون بزبان انگریزی

Israr Ahmad, Doctor
Memorandum Presented to Mian Nawaz Sharif — Mar.97

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

کی ایک اہم تالیف

برِّعظیم پاک و ہند میں

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

اور اس سے انحراف کی راہیں

جس میں

- اسلام کے ابتدائی انقلابی فکر اور اس میں زوال کی تاریخ کے جائزے کے بعد
- علامہ اقبال کے ذریعے اس کی تجدید اور مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے ہاتھوں اس کی تعمیل کی مساعی اور ان کے حاصل، اور
- "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ میں ناگزیر تدریج اور اس کے تقاضوں" کے علاوہ
- اس فکر سے انحراف کی بعض صورتوں پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے ——————!

سفید کاغذ پر ۱۰۴ صفحات، مع دیدہ زیب ہارڈ کور —— قیمت فی نسخہ -/۴۰